اقبال

اور

منکرینِ حدیث

مصنّفہ

پروفیسر محمد فرمان ایم۔اے

(جملہ حقوق بحق محمد زبیر سلمہ محفوظ)

DATA ENTERED

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

محمد خورشید خالد منیجر نے
پنجاب الیکٹرک پریس پرانا اڈا اجلا پوری گجرات سے چھپوا کر
مکتبہ محمدیہ نور پور شرقی
گجرات سے شائع کیا

تعداد ـــــــ ایک ہزار
بار اوّل ـــــــ ۱۹۶۳

قیمت
فی جلد عمدہ اڈیشن ـــــــ تین روپیہ
عام ـــــــ ڈھائی روپیہ

مکتبہ محمدیہ نور پور شرقی گجرات

انتساب

شیخ طریقت جناب کرم الٰہی نقشبندی مجددی

کے

نام

29.9.69 Rs 2.50

فہرست مضامین

دیباچہ ۹

اقبال کے انگریزی خطبات ۱۲

پروفیسر گولڈ تسیہر کی تنقید حدیث ۱۹

امام ابو حنیفہؒ کا اجتہادی مقام ۲۱

امام اعظم پر الزام ۲۳

عرف اور تشریع ۲۷

حدیث کے متعلق اقبال کا نظریہ ۳۰

زمانے کے حالات اور احکام کا تعلق ۳۲

مساوات مرد و زن ۳۳

قانون وراثت ۳۵

قانون وراثت کا بغور مطالعہ ۴۰

نرگس کی بیداری ۴۱

وضاحت (علامہ کے مسلک کی) ۴۳

حدیث کے ایک اشارے کی اہمیت ۴۴

علامہ کا صحیح مفہوم ۴۴

ایک سوال (جسکا کتاب اللہ سے متعلق) ۴۵

رحلت کے وقت حضور کا کاغذ طلب کرنا ۴۶

اندازِ گفتگو ۴۹

سرقہ ۵۰

زنا ۵۳

شراب ۵۹

سود ۵۹

زندگی کے متغیر حالات اور قانون سازی ۶۰

کیا احکام وقتی ہیں ۶۵
کلمہ طیبہ ۶۶
نماز ۶۶
حدیث پر حملہ اور اسکی مدافعت ۶۸
پرچہ اوّل (منجانب منکر حدیث) ۷۱
جواب پرچہ اوّل (ایک مصدّق حدیث کی طرف سے ۸۱
اہل قرآن اور حدیث ۹۰
اصلاح نماز (منجانب منکرین حدیث) ۹۴
اہل حدیث (منکرین پر تنقید) ۹۶
امرتسر کی اہل قرآن جماعت میں برہو ازم ۹۸
امرتسری اہل قرآن (منکرین حدیث) ۹۹
حقیقت نماز (منکرین کے ہاں) ۱۰۳
مسئلہ قبلہ ۱۰۴
اہل قرآن (منکرین حدیث) اور آذان ۱۰۹
منکرین کے مسلک پر تنقید ۱۱۵
مولوی حشمت علی (منکر حدیث) اور آذان ۱۱۷
منکرین حدیث پر تنقید ۱۲۵
تعجب (مسلمانوں کے ہاں آذان کے الفاظ میں اختلاف ۱۲۷
اذان میں کوئی اختلاف نہیں ۱۲۸
بہتان از اہل قرآن (منکرین حدیث) ۱۳۰
جواب از اہلحدیث ۱۳۵
امام بخاریؒ پر ایک الزام کا جواب ۱۳۹
منکرین حدیث کی نماز ۱۴۱
بلاغ (منکرین حدیث کا رسالہ) ۱۴۵
رجوع بمطلب انکار حدیث کی پہلی آواز ۱۴۸
مولوی عبداللہ چکڑالوی اور نماز ۱۴۹
منکرین حدیث کا تیسرا فرقہ اور نماز ۱۵۵

قرآنی نماز بتشریح حدیث ۱۷۸
منکرین حدیث کی نمازیں اور ان میں باہمی اختلاف ۱۸۶
منکرین حدیث اور اہل حدیثؒ کی نزاع میں تنقیح ۱۸۹
اہل قرآن کی حرکت مذبوحی ۱۹۸
عبداللہ چکڑالوی صاحب اور حشمت علی صاحب ۱۹۹
قرآن کے اجمال اور تفصیل کی بحث ۲۰۱
نیاز فتحپوری (ایک منکر حدیثؒ) کی غلط بیانی ۲۰۶
امام احمد بن حنبل رح ۲۱۳
صحیحین میں اختلاف کی نوعیت ۲۱۵
نیاز فتحپوری کے عقیدے ۲۱۷
طلوع اسلام کا مسلک ۲۲۳
اس مسلک کی اصلیت ۲۲۷
منکرین حدیث کے امام کے الہام کا انجام ۲۳۱
منکرین حدیث اور انکار رسالت ۲۳۵
منکرین حدیثؒ سے چند سوالات ۲۳۶

اللہ مُفتّح الابواب

پاکستان اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا ہے۔ اس مملکت خداداد کا مالک اللہ ہے۔ وہی اس کا حافظ اور وہی اس کے استحکام کا ضامن ہے۔ پاکستان کے آزاد شہریوں کی ذمہ داریاں نہایت غیر معمولی ہیں۔ ان میں نہایت اہم ذمہ داری اس مملکت کے لیے اسلامی آئین کی تدوین اور ترویج ہے۔ جمہور مسلمانوں کے نزدیک کتاب مبین (قرآن) کے بعد سنتِ رسولؐ امین قانون کا ضروری اور لابدی ماخذ ہے۔

بدقسمتی سے اس ملک میں سنّت کے خلاف ایک مہم برسرکار ہے۔ اس مہم کے سربراہ علامہ اقبال مرحوم کے مدّاح ہیں اور اپنے افکار کو ..... اُن کے افکار کی تشریح گردانتے ہیں۔ ان بزرگواروں کے اندازِ فکر کو واضح کرنے کے لیے "اقبال اور منکرین حدیث" کے زیرِ عنوان یہ مقالہ ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے اور یہ کوشش کی گئی ہے

کہ علّامہ مرحوم کا صحیح مسلک واضح ہو اور ان کے "مریدوں" کی تصویر کے صحیح خدوخال عوام کے سامنے آسکیں۔ تاکہ یہ ملک جس مقصد کے لیے وجود میں آیا تھا اس کے پورا ہونے میں غلط قسم کے افکار و تصوّرات سدّراہ نہ بن سکیں۔

دیباچہ

"دگر از سر گرفتم قصّۂ زلفِ پریشاں را"

جب کوئی قوم معاشی اور سیاسی طور پر سربلند نہیں رہتی تو اس کے افکار پر بھی لامحالہ اس زمانے کی برسرِ اقتدار اقوام کے خیالات و تصورات اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔ زیردست قومیں اس زمانے میں جو نقصانات اٹھاتی ہیں اُن میں یہ ذہنی انقاد اور بے چارگی والا نقصان اُن کے مستقبل کے لیے اور زندہ افکار کے لیے نہایت خطرناک اور مہلک ہوتا ہے۔ یورپ کی بالادستی نے ہمیں ذہنی طور پر جو کچھ دیا ہے، اُس سے کہیں زیادہ ہمارے ذہنوں کو اُس نے پستی اور پژمردگی سے دو چار کر کے مفلوج کر دیا ہے۔ ہمارے کالجوں کے نوجوان مغربی ناقدوں کے پرستار اور ان کے زورِ قلم کے مدّاح ہوتے ہیں۔ مغربی عالموں کی رائے ان کے نزدیک وحی سے کمتر نہیں ہوتی اور وہ اس مرض کے بری طرح شکار ہو کر اپنے ہم وطن اہلِ علم اور مشرقی علماء کے

مبلغ علم کو خاطر میں نہیں لاتے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کا نظامِ تعلیم مغربی افکار کی گود میں سر دھرنے کو ہمیشہ سے پسند کرتا آیا ہے۔ اس کے لیے مغربی لوریاں نہایت دلپذیر ہیں ان میں مٹھاس بھی ہے اور آزادی بھی۔

مغرب پسندی شاید مغربی عینک لگا کر اپنے گھر کی سیر کرنے کا نتیجہ تھا کہ گذشتہ نومبر میں اسلامیات کے ایک طالب علم نے جو بی۔ اے کے آخری سال میں تھا راقم سے یہ سوال کیا کہ "قرآن کی حفاظت تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے، لہٰذا یہ کتاب زیر اور زبر کی درستی کے ساتھ موجود ہے لیکن اس کے برعکس احادیث کے مجموعوں کی صحت کی کیا ضمانت ہے؟" راقم نے اس سوال کا مدلل اور مفصل جواب تو دے دیا لیکن اس برخوردار کی تسلی نہ ہو سکی۔ وہ لاہور کے ایک موقر جریدہ کا باقاعدگی سے مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس جریدہ میں جو افکار ہوتے وہ انہیں بار بار پڑھتا، خاص کر علامہ اقبال مرحوم کے ساتھ اس رسالہ کے مدیر کو جو عقیدت تھی وہ اس برخوردار کو بھی متاثر کیے ہوئے تھی۔ لہٰذا کوئی دلیل کوئی مباحثہ اس کی تشفی کے لیے سودمند نہیں تھا۔

اِس بحث کے بعد راقم کے دل میں اس موضوع پر قلم اُٹھانے کی

خواہش زیادہ تیز ہوگئی (یہ خواہش پہلے سے موجود تھی لیکن اس میں شدت پیدا کرنے کا سہرا اسی برخوردار کے سر ہے)۔

علامہ اقبالؒ

پاکستان کی سیاسی اور ذہنی تاریخ لکھنے والا علامہ اقبالؒ کو ہمیشہ سرفہرست جگہ دے گا۔ انھوں نے برعظیم ہندو پاک کے مسلمانوں کو آزادی کا پیغام دیا۔ انھیں خودداری کا احساس دلایا۔ مغرب کی ذہنی غلامی کی خامیاں واضح کیں۔ ناقۂ بے زمام کو سوئے قطار لے جانے کی جد وجہد کی۔ انھوں نے اپنی اور اہل اسلام کی منزل حرم محترم کو قرار دیا۔ انھوں نے، رُومی کی طرح حرم میں اذان دی۔ فتنۂ عصرِ حاضر کے قلع قمع کے لیے اُن سے جو بن آیا، کیا۔ اُن کے قلم نے جو جواہر پارے پیدا کیے۔ اُن کی قدر و قیمت کما حقہٗ نہیں ہو سکی۔ اُن کے افکار کی تشریح و توضیح کی ضرورت پوری نہیں ہو سکی۔ انھوں نے فرمایا تھا ؎

میرے حلقۂ سخن میں ابھی زیرِ تربیت ہیں
وُہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسم بادشاہی

اپنے حلقۂ اثر میں اُنھیں اپنے مریدوں کے جوش اور ولولہ سے ایسا ہی محسوس ہوا ہوگا، مگر ان کی وفات کے بعد ان کے بعض پیروکاروں نے انکے افکار کی صورت کو حتی الامکان مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہت سی

غلط باتیں علامہ مرحوم کے نام منسوب کر دی گئی ہیں جن سے ان کے مسلک کو نقصان پہنچا ہے۔

علامہ مرحوم نے اپنے خطبات میں اسلام اور الٰہیات سے متعلق اپنے جن خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ وہ عظیم اور مفید ہونے کے باوجود مذہبی افکار میں حرفِ آخر نہیں ہیں۔ اُنھوں نے اس کتاب کے دیباچے میں اس امر کی یوں صراحت فرمائی ہے۔

"..... یاں ہمہ یاد رکھنا چاہیے۔ کہ فلسفیانہ غور و فکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں جیسے جیسے جہان علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے اور فکر کے لیے نئے نئے راستے کھل جاتے ہیں، کتنے ہی اور، اور شاہدان نظریوں سے جو ان خطبات میں پیش کیے گئے ہیں، زیادہ بہتر نظریے ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ ہمارا فرض بہرحال یہ ہے کہ فکرِ انسانی کے نشو و نما پر باحتیاط نظر رکھیں۔ اور اس باب میں آزادی کے ساتھ نقد و تنقید سے کام لیتے رہیں" (خاتمہ دیباچہ)

ان خطبات کا دائرہ نہایت وسیع اور عظیم ہے۔ ان میں ان مسائل سے متعلق بحث ہے جو اسلامی دنیا کے لیے آج زندگی اور موت کے مسائل ہیں مثلاً اجتہاد کے بارے میں جو نظریات پیش کیے گئے ہیں

وہ قابل مطالعہ اور نہایت وقیع ہیں، اسی خطبے میں قانون سازی سے بحث کرتے ہوئے اُنھوں نے قرآن کو ماخذ قانون ماننے کے بعد احادیث کا ذکر کیا ہے اور اُن کی افادیت پر اپنا نقطۂ نظر بتایا ہے بدقسمتی سے علامہ مرحوم سے اس مقام پر چند ایسی فروگذاشتیں ہوگئی ہیں جن پر اُن کے "مریدِ دل" نے ایک حصار تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں اس امر کا اعتراف ہے کہ علامہ مرحوم کا مقام مسئلۂ اجتہاد کو سمجھنے میں بہت بلند ہے ۱۹۵۹ء میں لاہور میں جو اسلامی مجلسِ مذاکرہ ہوئی تھی اس میں اس موضوع سے متعلق بھی چند مقالے پڑھے گئے تھے اس مجلس کے تمام مقالے پڑھنے کے بعد ایمانداری سے یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ جس نہج سے علامہ نے مسئلہ کو اُٹھایا ہے اور جس طرح ضرورت اجتہاد پر اُنھوں نے زور دیا ہے۔ محولہ بالا مجلس مذاکرہ کے علماء سے بات ویسے نہیں بن سکی ہے، بایں ہمہ علامہ سے اس خطبے میں جو فروگذاشتیں ہوئی ہیں، اُن کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے، ہم سرِدست صرف اس مقام سے بحث کریں گے جو احادیث کے متعلق ہے۔

غازی (مدیر ادارہ)

۶ رجون ۱۹۶۲ء ۳ رمحرم ۱۳۸۲ھ

احادیثِ رسولِ کریمؐ

اسلام میں قانون سازی

علّامہ قرآن کو اسلامی قانون سازی میں اوّلین ماخذ تسلیم کرنے کے بعد (اور اس کے اندر جو روح دواں ہے اس کی نشاندہی کرتے ہوئے) احادیث پر یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

"اسلامی قانون کا دوسرا بنیادی ماخذ احادیث رسول اللہ صلعم ہیں، جو ماضی اور حال ہر زمانے میں بڑی بڑی شدید بحثوں کا موضوع رہیں۔ عہدِ حاضر کے ناقدین میں سے پروفیسر گولڈ تسیہر نے (جو ان قوانین کی رُو سے جن کا تعلق تاریخی تنقید سے ہے، احادیث کے بارے میں بڑے تفحّص سے کام لیا ہے اور اس کا کہنا یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی ہمیں ان کو ناقابلِ اعتبار ٹھہرانا چاہیے۔ ایسے ہی ایک دوسرے مغربی اہلِ قلم نے اول تو صحت و عدم صحت حدیث کے ان طریقوں پر نظر ڈالتے ہوئے جو مسلمانوں میں رائج ہیں اور پھر یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ نظری اعتبار سے ان میں کہاں کہاں غلطیوں کا امکان ہے،

درج ذیل نتیجہ قائم کیا ہے:

"لیکن اس بحث کے خاتمے پر یہ کہنا بھی لازم آتا ہے کہ ہم نے اوپر جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا تعلق صرف نظری امکانات سے ہے رہا یہ سوال کہ ان امکانات نے فی الواقعہ کہاں تک ایک عملی صورت اختیار کی سو اس کا جواب اس سوال سے وابستہ ہے کہ اس وقت کے احوال و ظروف نے کہاں تک ان امکانات سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دلائی۔ اب اگر سچ پوچھا جائے تو اس قسم کے احوال و ظروف نسبتاً شاذ تھے۔ اور اس لیے سنت کا بہت تھوڑا حصہ ان سے متاثر ہوا۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے یہاں جو مجموعہ ہائے احادیث معتبر ٹھہرائے جاتے ہیں ان کا زائد حصہ فی الواقعہ اسلام کے ظہور اور ابتدائی نشوونما کی حقیقی تاریخ ہے"۔

لیکن جہاں تک مسئلۂ اجتہاد کا تعلق ہے ہمیں چاہیے کہ ان احادیث کو جن کی حیثیت سر تا سر قانونی ہے ان احادیث سے الگ رکھیں جن کا قانون سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر اوّل الذکر کی بحث میں بھی ایک بڑا اہم سوال یہ ہوگا کہ ان میں عرب قبل اسلام کے رسم و رواج کا جسے جوں کا توں چھوڑ دیا گیا یا جس میں حضور رسالت مآب صلعم نے تھوڑی بہت ترمیم کر دی کس قدر حصہ موجود ہے لیکن یہ وہ

حقیقت ہے جس کا انکشاف مشکل سے ہو سکے گا کیونکہ علمائے متقدمین شاذ ہی اس رسم و رواج (عرف) کی طرف اشارہ کرتے ہیں ہمیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں۔ کہ جس رسم و رواج کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا، خواہ حضور رسالت مآب صلعم نے اس کی بالصراحت منظوری دی یا خاموشی اختیار فرمائی۔ اس پر کیا بحث ہر کہیں اور ہر زمانے میں عمل کرنا مقصود تھا۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس مسئلے میں بڑی سبق آموز بحث اٹھائی ہے ہم اس کا مفاد ذیل میں پیش کریں گے۔

شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں، انبیا کا عام طریقِ تعلیم تو یہی ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں ان پر اس قوم کے رسم و رواج اور عادات و خصائص کے مطابق شریعت نازل کی جاتی ہے لیکن جس نبی کے سامنے ہمہ گیر اصول ہیں اس پر نہ تو مختلف قوموں کے لیے مختلف اصول نازل کیے جائیں گے نہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہر قوم کو اپنی اپنی ضروریات کے لیے الگ الگ اصول و عمل متعین کرنے کی اجازت دے۔

وہ کسی ایک قوم کی تربیت کرتا اور پھر ایک عالمگیر شریعت کی تشکیل میں اس سے تمہید کا کام لیتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے میں وہ اگرچہ انھیں اصولوں کو حرکت دیتا ہے جو ساری نوعِ انسانی کی حیاتِ اجتماعیہ میں کارفرما ہیں، پھر بھی ہر معاملے اور ہر موقع پر عملاً ان کا اطلاق اپنی

اپنی قوم کی مخصوص عادات کے مطابق ہی کرتا ہے۔ لہٰذا اس طرح جو احکام وضع ہوتے ہیں (مثلاً تعزیرات) ایک لحاظ سے اسی قوم کے لیے مخصوص ہوں گے۔ پھر چونکہ احکام مقصود بالذات نہیں، اس لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لیے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابو حنیفہ نے جو اسلام کی عالمگیر نوعیت کو خوب سمجھ گئے تھے۔ احادیث سے اعتنا نہیں کیا۔ اُنھوں نے اصول استحسان یعنی "فقہی ترجیح" کا اصول قائم کیا۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ قانونی غور و فکر میں ہم ان احوال و ظروف کا بھی جو واقعتاً موجود ہیں باحتیاط مطالعہ کریں۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس فقہ اسلامی کے ماخذ کے بارے میں ان کا رویہ کیا تھا۔ رہا یہ کہنا کہ امام موصوف نے احادیث سے اس لیے اعتنا نہیں کیا کہ ان کے زمانے میں کوئی مجموعہ احادیث موجود نہیں تھا۔ سو اس سلسلے میں اول تو یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اس زمانے میں احادیث کی تدوین نہیں ہوئی تھی کیونکہ عبدالملک اور زہری کے مجموعے امام موصوف کی وفات سے کم از کم تیس برس پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ ثانیاً اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ امام موصوف ان مجموعوں سے فائدہ نہیں اُٹھا سکے، یا یہ کہ ان میں فقہی احادیث موجود

نہیں تھیں۔ جب بھی وُہ ضروری سمجھتے تو امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی طرح خود اپنا مجموعہ احادیث تیار کر سکتے تھے۔ لہٰذا بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو میری رائے میں امام موصوف نے فقہی احادیث کے بارے میں جو روش اختیار کی سرتاپا جائز اور درست تھی۔ اندریں صورت اگر آزادیٔ اجتہاد کی وُہ تحریک جو اس وقت دنیائے اسلام میں پھیل رہی ہے۔ احادیث کو بلا جرح و تنقید قانون کا ماخذ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو اس سے اہل سنت والجماعت کے ایک امام الائمہ ہی کی پیروی مقصود ہے۔ بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیے کہ سب سے بڑی خدمت جو محدثین نے شریعت اسلامیہ کی سرانجام دی وہ یہ ہے کہ اُنھوں نے مجرد غور و فکر کے رجحان کو روکا اور اس کی بجائے ہر مسئلے کی الگ تھلگ شکل اور انفرادی حیثیت پر زور دیا۔ لہٰذا احادیث کا مطالعہ اگر اور زیادہ گہری نظر سے کیا جائے، اور ہم ان کا استعمال یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ وہ کیا رُوح تھی جس کے ماتحت آنحضرت صلعم نے احکام قرآنی کی تعبیر فرمائی۔ تو اس سے ان قوانین کی حیاتی قدر و قیمت کے فہم میں اور بھی آسانی ہو گی، جو قرآن پاک نے قانون کے متعلق قائم کیے ہیں۔ پھر یہ ان اصولوں کی حیاتی قدر و قیمت ہی کا پورا پورا علم ہے جس کی بدولت ہم اپنی

فقہ کے بنیادی مآخذ کی از سرِ نو تعبیر اور ترجمانی کر سکتے ہیں"[1]۔

یہ اقتباس بڑی دقتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کیے جانے کے قابل ہے۔ عہدِ حاضر کے ایک ناقد حدیث پروفیسر گولڈ تسیہر کا یہ خیال کہ بحیثیت مجموعی ہمیں ان کو ناقابلِ اعتبار ٹھہرانا چاہیے" اور اس پر علامہ اقبالؒ کا سکوت اور ایک طرح کا اطمینان یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ علامہ مرحومؒ کو پروفیسر موصوف کی رائے سے اختلاف نہیں ہے۔ دوسرے ناقد کی رائے میں اتنی گنجائش نکلتی ہے کہ احادیث کا بیشتر حصہ اُس وقت کے احوال سے متاثر ہونے سے بچ رہا ہے۔ "گویا فی الواقعہ اسلام کے ظہور اور ابتدائی نشوونما کی تاریخ ہے" اس کے بعد قانونی حیثیت والی احادیث کے ضمن میں مروجہ رسومات، عادات، الحوار (عرف) کے پیشِ نظر شارع اسلام علیہ السلام نے جن رواجات پر سکوت اختیار فرمایا ہے اور جن میں کسی قسم کی تبدیلی روا نہیں رکھی ہے ان عادات (عرف) کے بارے میں یہ خیال کہ معلوم نہیں ایسا سکوت ہمیشہ کے لیے قابلِ عمل ہے یا محض اس وقت کے لیے، نیز اسلامی تعزیرات کا عالمگیر ہونے کے باوجود عرب قوم کے حالات سے متعلق ہونا۔ اور یہ شک کہ "چونکہ احکام مقصود بالذّات نہیں

---

[1] اردو ترجمہ، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۲۶۵ - ۲۶۷

اس لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لیے بھی واجب ٹھہرایا جائے"۔ احادیث کی عملی حیثیت پر سخت اثر انداز ہوتا ہے جب علامہ اپنی اس رائے کو امام اعظم ابو حنیفہؒ کے مزاج اور افتادِ طبع کے مطابق قرار دیتے ہوئے دلیل کی سطح پر آتے ہیں تو احادیث کا ماخذِ قانون ہونا نہایت درجہ مشتبہ اور غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ "شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابو حنیفہؒ نے جو اسلام کی عالمگیر نوعیت کو خوب سمجھ گئے تھے۔ احادیث سے اعتنا نہیں کیا ..... لہٰذا بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو میری رائے میں امام موصوف نے فقہی احادیث کے بارے میں جو روش اختیار کی سرتا پا جائز اور درست تھی" گویا احادیث سے (فقہی معاملات میں) بے نیازی کوئی نقصان دہ طریق فکر نہیں ہے۔

علامہ مرحوم آزادی اجتہاد کی جدید تحریک (جو ترکی میں اپنا رنگ دکھا رہی تھی) کے اندازِ فکر کو یعنی احادیث کو بلا جرح و تنقید قانون کا ماخذ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہونے کو امام موصوفؒ کی ایک طرح کی پیروی قرار دیتے ہیں جب ایک قاری ان کی اس تنقید پر پہنچتا ہے تو اس کے دل سے احادیث کی انفادی حیثیت اور قانونی عظمت جاتی رہتی ہے۔ اس اقتباس کا آخری حصہ نہایت درجہ اہم اور فی الواقعہ علامہ مرحومؒ کے ان خیالات کا محور ہے جو وہ احادیث کی قانونی حیثیت کے بارے میں

رکھتے تھے۔ ہم اس حصّے کی تنقید و توضیح سے پہلے ماسبق اہم حصّوں کو زیر بحث لاتے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کا اجتہادی مقام

"امام ابو حنیفہؒ کے متعلق ابن خلدون نے نہ معلوم کس سند پر یہ بات لکھ دی تھی کہ حدیث قبول کرنے میں ابو حنیفہؒ اتنے متشدّد تھے کہ ان کے نزدیک سترہ سے زیادہ حدیثیں صحیح نہ تھیں" یہ بات چلتے چلتے لوگوں میں اس طرح مشہور ہوئی کہ امام ابو حنیفہ کو صرف سترہ حدیثوں کا علم تھا۔ یا یہ کہ انھوں نے صرف سترہ حدیثوں سے مسائل اخذ کیے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل ایک خلاف واقعہ افسانہ ہے۔ آج امام ابو حنیفہؒ کے سب سے بڑے شاگرد امام ابو یوسفؒ کی مرتب کردہ کتاب الآثار شائع شدہ موجود ہے جس میں انھوں نے اپنے استاد کی روایت کردہ ایک ہزار احادیث جمع کی ہیں۔ اس کے علاوہ امام کے دوسرے دو نامور شاگردوں امام محمد اور امام حسن بن زیاد اللؤلؤی نے اور امام کے صاحبزادے حماد بن ابی حنیفہ نے بھی اُن کی روایت کردہ احادیث کے مجموعے مرتب کیے تھے۔ پھر مسلسل کئی صدیوں تک بکثرت علماء ان کی مرویات کو مسند امام ابی حنیفہ کے نام سے جمع کرتے رہے۔ ان میں سے پندرہ مسانید کا ایک جامع نسخہ قاضی القضاۃ محمد بن محمود

الخوارزمی نے "جامع مسانید امام الاعظم" کے نام سے مرتب کیا جسے دائرۃ المعارف حیدر آباد نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ یہ کتابیں اس دعوے کی تردید قاطع ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ صرف سترہ حدیثیں جانتے تھے۔ یا انھوں نے صرف سترہ حدیثوں سے استدلال کرکے فقہی مسائل نکالے ہیں۔ علم حدیث میں امام کے استادوں کی تعداد (جن سے اُنھوں نے روایات لی ہیں) چار ہزار تک پہنچتی ہے۔ ان کا شمار اکابر حفاظِ حدیث میں کیا گیا ہے۔ اِن کی مسانید جمع کرنے والوں میں دار قطنی، ابن شاہین اور ابنِ عقدہ جیسے نامور علماء حدیث شامل ہیں، کوئی شخص فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں سے اگر صرف امام طحاوی کی شرح "معانی الآثار" ابوبکر حصّاص کی "احکام القرآن" اور امام سرخسی کی "المبسوط" ہی کو دیکھ لے تو اسے یہ غلط فہمی کبھی بھی لاحق نہ ہو، کہ امام ابوحنیفہ نے احادیث سے بے نیاز ہوکر صرف قیاس اور قرآن پر اپنی فقہ کی بنیاد رکھی تھی۔

پھر حدیث سے استناد کے معاملہ میں امام ابوحنیفہؒ کا جو مسلک تھا اسے انھوں نے خود ان الفاظ میں بیان کیا ہے "مجھے جب کوئی حکم خدا کی کتاب میں مِل جاتا ہے تو میں اس کو تھام لیتا ہوں، اور جب اس میں نہیں ملتا تو رسول اللہؐ کی سنت اور آپؐ کے صحیح آثار

کو لیتا ہوں جو ثقہ لوگوں کے ہاں ثقہ لوگوں کے واسطے سے معروف ہیں پھر جب نہ کتاب اللہ میں حکم ملتا ہے، نہ سنت رسول اللہ میں تو میں اصحاب رسول کے قول (یعنی ان کے اجماع) کی پیروی کرتا ہوں اور ان کے اختلاف کی صورت میں جس صحابی کا قول چاہتا ہوں قبول کرتا ہوں اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں۔ مگر ان سب کے اقوال سے باہر جا کر کسی کا قول نہیں لیتا۔ رہے دوسرے لوگ تو جس طرح اجتہاد کا حق انھیں ہے مجھے بھی ہے[1]"

امام اعظمؒ پر الزام

امام ابو حنیفہؒ کے سامنے ایک مرتبہ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس پر انھوں نے فرمایا بخدا اس شخص نے جھوٹ کہا اور ہم پر افترا کیا جس نے کہا کہ ہم قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں۔ بھلا نص کے بعد بھی قیاس کی کوئی حاجت رہتی ہے[2]"

خلیفہ منصور نے ایک مرتبہ امام کو لکھا کہ میں نے سنا ہے آپ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے ہیں جواب میں انھوں نے لکھا:

---

[1] تاریخ بغداد للخطیب جلد ۱۳ ص ۳۶۸ مناقب امام اعظم للموفق المکّی جلد ۱، ص ۷۹ وغیرہ۔

[2] کتاب المیزان للشعرانی جلد ۱، ص ۶۱۔

"امیرالمومنین جو بات آپ تک پہنچی وہ صحیح نہیں ہے میں سب سے پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر، پھر ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے فیصلوں پر، پھر باقی صحابہؓ کے فیصلوں پر، البتہ جب صحابہ میں اختلاف ہو تو قیاس کرتا ہوں"[1]

علامہ ابن حزم نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ! "تمام اصحاب ابی حنیفہ اس بات پر متفق ہیں کہ ابوحنیفہ کا مذہب یہ تھا کہ ضعیف حدیث بھی مل جائے تو اس کے مقابلے میں قیاس اور رائے کو چھوڑ دیا جائے"[2][3]

امام اعظمؒ کے طریق اجتہاد کے بارے میں غلط روایات کی شہرت کی وجہ ہی سے علامہ اقبال نے مندرجہ بالا رائے ان کے طریق کار کے متعلق قائم کی ہے اور ان کی اس رائے کی روشنی میں دوسرے اہل علم کا بھی یہی مسلک متعین ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک فاضل جج کا ارشاد ہے:

---

[1] کتاب المیزان للشعرانی ص ۶۲۔

[2] مناقب امام ابوحنیفہ وصاحبین للذہبی۔ ص، ۲۱

[3] اقتباس از ترجمان القرآن جلد ۵۶، عدد ۶، منصب رسالت نمبر ص ۳۱۷ - ۳۱۹ - تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرۃ النعمان شبلی نعمانی

"مگر ابو حنیفہ نے جو سنہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور جن کا انتقال ستر سال بعد ہوا تقریباً سترہ ۱۱ اٹھارہ حدیثیں ان مسائل کا فیصلہ کرنے میں استعمال کیں جو ان کے سامنے پیش کیے گئے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ سے اس قدر قریب نہ تھے جس قدر پہلے چار خلفاء تھے۔ انھوں نے تمام فیصلوں کی بنا قرآن کی مکتوب ہدایات پر رکھی اور متن قرآن کے پیچھے اُن محرکات کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو ان ہدایات کے موجب تھے۔ وُہ استدلال و استنباط کی بڑی قدرت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے عملی حقائق کی روشنی میں قیاس کی بنیاد پر قانون کے اصول اور نظریات مرتب کیے۔ اگر ابو حنیفہ یہ حق رکھتے تھے کہ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کی تفسیر موجود الوقت حالات کی روشنی میں کریں تو دوسرے مسلمانوں کو یہ حق دینے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"[1]

اس ارشاد کے مطالعہ کے بعد اقبال کی محولہ بالا رائے دوبارہ دیکھی جائے۔ مثلاً "شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابو حنیفہ نے جو اسلام کی عالمگیر حیثیت کو خوب سمجھ گئے تھے۔ احادیث سے اعتنا نہیں کیا۔ انھوں نے اصول استحسان یعنی فقہی ترجیح کا اصول قائم کیا

---

[1] اقتباس از صفحہ ۱۷، ۳۱۔ رسالہ ترجمان القرآن منصب رسالت نمبر۔

جس کا تقاضا یہ ہے کہ قانونی غور و فکر میں ہم ان احوال و ظروف کا بھی جو واقعتاً موجود ہیں باحتیاط مطالعہ کریں ..... اندریں حالات اگر آزادی اجتہاد کی وہ تحریک جو اس وقت دنیائے اسلام میں پھیل رہی ہے۔ احادیث کو بلا جرح و تنقید قانون کا ماخذ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو اس سے اہل سنت والجماعت کے ایک امام الائمہ ہی کی پیروی مقصود ہے"!

یہ تحریک ترکی میں پھیل رہی تھی اس کے خطرناک نتائج کا جب علامہ نے بعد میں بغور مطالعہ کیا۔ تو وہ اس تحریک سے سخت بیزار ہو گئے اور انھوں نے جاوید نامہ میں اس تحریک کے علمبردار مصطفیٰ کمال پاشا پر کڑی تنقید کی:

مصطفیٰ کو از تجدد می سرود
گفت ہر نقشِ کہن باید زدود
تو نہ گردد کعبہ را ساز حیات
گر ز افرنگ آیدش لات و منات

ترکوں نے بھی فرنگ سے لات و منات درآمد کیے تھے اور آج ہم بھی مغربی اقوام کی بالادستی سے متاثر ہو کر ان کے بتوں کو لبیک کہہ رہے ہیں اور اس خوش آمدید کا نتیجہ ہماری ماضی کی تاریخ کو

دیکھتے ہوئے کسی صورت میں بھی سودمند نہیں ہوگا۔ لہٰذا حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کی تفسیر کا حق موجود الوقت حالات کی روشنی میں دوسرے مسلمانوں کو دینا درست نہ ہوگا۔

امام اعظمؒ کے بارے میں یہ غلط فہمی ابن خلدون کی پھیلائی ہوئی ہے۔ علامہ نے اسے درست تسلیم کرتے ہوئے جو علمی غلطی کی ہے اس کی اصلاح کرنا اقبال پسند دل کا ایک اہم فریضہ ہے۔ علّامہ ابن خلدون سے نہایت متاثر تھے انھوں نے اپنے تاثر کا اظہار اس خطبہ میں اور اس سے پہلے اپنے خطبہ اسلامی ثقافت کی روح میں بڑے اچھے الفاظ میں کیا ہے۔

عرف اور تشریع اقتباس کی دوسری اہم بحث عرف اور تشریع، کے باہمی تعلق کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اِس موضوع پر بہت سے مسلمان مفکرین نے قلم اٹھایا ہے۔ ان میں سے قابل توجہ ارشادات امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں ہیں اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتاب حجتہ اللہ البالغہ میں بعنوان ارتفاقات موجود ہیں۔ شاہ صاحب نے یہ بتایا ہے کہ "جب کوئی صاحب شرع پیغمبر مبعوث ہوتا ہے تو وہ اپنی قوم کی اُن عادات اور طور طریقوں سے تعرض نہیں فرماتا جو اس کے دین سے

متصادم نہ ہوتے ہوں، بلکہ اُنھیں اُن کی حالت پر ہی چھوڑ دینا دینی مصلحت ہوتی ہے"۔

اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ صاحبِ شرع پیغمبر وقت کی ہر قسم کی رسومات کے ساتھ تعاون کر لیتا ہے اور یوں اپنی دشواریوں کے دائرہ کو وسیع نہیں ہونے دیتا۔ صحیح بات ہے کہ صاحب شرع کا کام انتظامات کو درہم برہم کرنا ہرگز ہرگز نہیں ہوتا بلکہ انتظامات میں جو خرابی یا خرابیاں اور بدعنوانیاں ہوتی ہیں۔ ان کو دور کرنا اور نیکی بدی میں تمیز کرانا اس کا اہم فریضہ ہوتا ہے۔ وُہ جس قوم میں مبعوث ہوتا ہے، اس قوم کے صرف اس عرف کو بحال رکھتا ہے جو دین کی رُو سے جائز ہو۔ اور یہ بحالی کسی وقتی مصلحت کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ اس نظریہ اور بصیرت کی اساس پر ہوتی ہے کہ اس قوم میں جو انبیاء پہلے مبعوث ہوئے اُن کی وساطت سے اس قوم میں جو باتیں رواج پا گئی تھیں۔ ان میں سے بعض کی صورت تو بالکل بدل چکی ہوتی ہے اور بعض اپنے حال پر ہی ہوتی ہیں لہٰذا ان معروف رسومات کو بحال رکھنا سابقہ انبیاء کی باتوں کو زندہ رہنے دینا ہوتا ہے۔ اور جو عرف دین سے متصادم ہو، اسے کوئی پیغمبر کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کا قلع قمع کرنا ہی تو

اس کا کام ہوتا ہے۔

حضور نبی کریمؐ نے عرب کے عرف میں سے جن باتوں کو بحال رکھا اُن کی بحالی اسی بصیرت کی رُو سے تھی۔ اجتہاد کرتے وقت اس طریق سے وُہ بات نہیں نکل سکتی۔ جو اقبال کی بات کو پوری طرح نہ سمجھنے کی بنا پر اقبال کے مُرید نکال رہے ہیں۔ یعنی ہر زمانے کے مخصوص حالات کی روشنی میں مسائل کا ان سے خواہ مخواہ کا تعلق پیدا کر لینا اور ماحول کے دباؤ سے احکام میں سببی قسم کی لچک پیدا کر لینا۔

حضور نبی کریمؐ نے عرب کی جن مروجہ رسومات کو قبولیت کی سند عطا فرمائی یعنی جن کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا۔ ان کے بارے میں تحقیق کرنے سے کہیں زیادہ یہ تحقیق سود مند ہو گی کہ آپؐ نے کن رسومات کو برداشت نہ کیا۔ اور ان کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا۔ مثلاً دختر کشی کو بند کرنا، فال نکالنے کی ممانعت کرنا۔ کاہنوں سے مستقبل کے حالات دریافت کرنے سے روک دینا۔ بہیمانیت کو خلاف شرع قرار دینا وغیرہ۔ ان کے مطالعہ سے اسلامی شریعت کے مزاج کی بخوبی وضاحت ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ آپؐ نے جن رسومات کو بحال رکھنے کی اجازت دے دی، یا ان کی بجاآوری

پرسکوت اختیار فرمایا۔ وُہ سابقہ انبیا کی پاک تعلیمات کے وہ چند ٹکڑے تھے جو کسی نہ کسی طرح تحریف اور تنسیخ کی زد سے بچ نکلے تھے۔

حدیث سے متعلق اقبال کا نظریہ

علامہ کا حدیث سے متعلق جو نظریہ ہے جیسا کہ بیان ہوا اُس کا آخری حصہ نہایت غور طلب تھا۔ اے کاش! حدیث کا انکار کرنے والے اس حصّے کو غور سے دیکھتے تو اُنھیں احادیث کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا اور وُہ اس متاعِ گراں مایہ کو قانون سازی کے وقت نظر انداز کرنے کی ترغیب نہ دلاتے۔

لکھتے ہیں:

"لہٰذا احادیث کا مطالعہ اگر اور گہری نظر سے کیا جائے اور ہم ان کا استعمال یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ وہ کیا رُوح تھی جس کے ماتحت آنحضرت صلعم نے احکام قرآنی کی تعبیر فرمائی....." مثلاً قرآن میں کسی جرم کے لیے سزا کا بیان آتا ہے اس جرم کی صحیح صورت کا تعین اور سزا کا اجرا کس ماحول اور کن حالات میں ہُوا۔ تاکہ ہم کسی جرم کو اس کے ماحول کے تعلق کی روشنی میں پوری طرح سمجھ لیں۔ اور سزا کو معاشرتی اور سیاسی حالات کے تعلق کے ساتھ متعین کرنا جان لیں۔ اس کا کیا فائدہ ہوگا۔ "تو اس سے ان قوانین کی حیاتی قدر و قیمت کے

فہم میں اور بھی آسانی ہوگی، جو قرآن پاک نے قانون کے متعلق قائم کیے ہیں"۔ یہ حیاتی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس سے یہ مراد ہے کہ قرآن میں ایک حکم نص قطعی کے ساتھ موجود ہے۔ مثلاً سرقہ، زنا، وغیرہ کی سزا اب اس حکم کا اجرا اس وقت کے حالات سے متعلق ہے یا اسے دوامی حیثیت حاصل ہے۔ اس بارے میں فیصلہ کرنا اس قانون کی حیاتی قدر و قیمت معلوم کرنا ہے۔ اور جب یہ قدر و قیمت واضح اور معلوم ہو جائے گی تو" پھر یہ ان اصولوں کی حیاتی قدر و قیمت ہی کا پورا پورا علم ہے۔ جس کی بدولت ہم اپنی فقہ کے بنیادی ماخذ کی از سر نو تعبیر اور ترجمانی کر سکتے ہیں"۔ یعنی اس قدر و قیمت کے تعین کے بعد یعنی کسی جرم کی سزا یا کسی حکم کی وقتی یا دوامی صورت جان لینے کے بعد ہم بدلے ہوئے حالات میں ایسے جرم کے لیے سزا تجویز کرنے کی خاطر اپنی فقہ کی جو نئی تدوین کریں گے۔ اس میں فقہ کے ماخذ (قرآن و احادیث) کی از سر نو (یعنی حالات کے تقاضوں کی روشنی میں) تعبیر کر کے قانون سازی کا حق ادا کریں گے۔

علامہ نے جو کچھ کہا ہے، اس سے احادیث کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ان اشارات سے احادیث کے غیر ضروری ہونے کے لیے بھی دلیل پیدا کی جا سکتی ہے۔ ایک سر پھرا شخص یہ

کہہ سکتا ہے، کہ علامہ کی مراد یہ ہے کہ اس مجموعے کو ناقابلِ اعتبار سمجھ کر غور و فکر سے محض اس لیے مطالعہ کرو کہ ان سے کس مسئلے کے لیے کیا معلومات ملتی ہیں، پھر اس کے بعد بدلے ہوئے حالات میں یہ ہمارا اپنا کام ہے کہ کس طرح کسی قرآنی حکم کی تعبیر کریں۔

ہماری بحث اب اس موڑ پر آگئی ہے کہ زمانے کے حالات اور احکام کا تعلق کیا ہے۔ قرآنی احکام اور اُن کی وہ تعبیر جو حضرت رسالت مآبؐ نے فرمائی تھی کیا وہ محض عرب کے اس وقت کے ماحول (سماجی، معاشری، تمدّنی اور سیاسی حالات) کی روشنی میں تھی؟ اور اب جب ماحول میں تبدیلی آچکی ہے تو کیا ان احکام میں بھی تبدیلی کرنی ضروری اور لابدی ہے؟ مثلاً:

۱۔ قرآن نے باپ کے ترکے میں بیٹی کو بیٹے کے حصّے کا نصف حصّہ دلایا ہے اور نص قطعی اس پر شاہد ہے۔ حضورؐ نے بھی اس کی یہی تعبیر فرمائی ہے۔

۲۔ سرقہ کے جرم پر قرآن نے (نص قطعی کی رُو سے) چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر کی ہے اور حضورؐ نے اس کی یہی تعبیر کر کے اس پر عمل فرمایا ہے۔

۳۔ زنا کے جرم کے لیے اس مجرم کے محصن یا غیر محصن ہونے کی

رُو سے حد مقرر کی گئی ہے۔ حضورؐ نے اس حد کو اپنے عہد میں یوں ہی جاری رکھا ہے۔

۴۔ قرآن نے محرمات کی جو فہرست بتائی ہے۔ حضورؐ نے اس کی تعبیر کرتے وقت اس فہرست کو مکمل کیا ہے۔ آپؐ کے عہد مبارک میں اس پر عمل ہوتا رہا ہے اور آج تک ہو رہا ہے۔

۵۔ قرآن نے شراب اور جوئے کو حرام قرار دیا ہے۔ حضورؐ نے اس کی بھی تعبیر فرمائی ہے اور ان کا حرام ہونا آج تک بدستور ہے۔

ہم سر دست ان پانچ چھ عنوانات کو زیر بحث لائیں گے۔ اس سے دوسرے معاملات پر بھی روشنی پڑ سکے گی۔

مساوات مرد و زن

مرد و زن کی مساوات کے خوش کن نعرے یورپ سے درآمد کیے جانے پر سب سے پہلے ترکی میں اس مساوات کے لیے جدوجہد شروع ہوئی۔ عورت نے مرد کے برابر کے حقوق کا مطالبہ کیا۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہر میدان میں ہر موڑ اور ہر زاویے میں برابری کے اس دعویٰ نے یورپ میں جو گل کھلائے ہیں اس سے یورپ کی جدید خاتون واقف ہو رہی ہے، مگر ترکی (اور آج پاکستان وغیرہ ممالک) کی خواتین،

کے لیے یہ تصوّرات نہایت مرغوب اور دل پسند تھے۔ یورپ میں عورتوں کو بے وقوف بنانے کے لیے اور اُن سے ہر وقت کُھلے بندوں اختلاط رکھنے کی نیت سے اُن کے جذبات کے ساتھ کھیلا گیا۔ اور اس طرح آزادی نسواں کی تحریک نے جنم لیا جس کے نتیجہ کے طور پر مرد و زن زبانی طور پر مساوی الحیثیت ہو گئے مگر عملی طور پر عورت کو اس کے ان حقوق کا عشر عشیر بھی نہ مل سکا جو اسلام آج سے تیرہ سو سال پہلے اسے دے چکا ہے۔

ترکی کا شاعر ضیا "زن و مرد کی مساوات کے جوش میں اسلام کے قانون عائلہ میں بھی جیسا کہ آج کل اس کو سمجھا اور عمل میں لایا جا رہا ہے چند تبدیلیوں پر زور دیتا ہے:

"اور پھر عورت ہے میری ماں، میری بہن، میری بیٹی، یہ عورت ہی تو ہے جس کی بدولت میری زندگی کی گہرائیوں سے مقدس ترین آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں۔ وہ میری محبوبہ ہے، میرا آفتاب، میرا ماہتاب، میرا ستارہ ہے۔ اُس نے مجھے زندگی سے آشنا کیا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقدس قانون اس حسین و جمیل مخلوق کو قابلِ نفرت ٹھہرائے! علمائے قرآن مجید کی تعبیر و تفسیر میں ٹھوکر کھائی ہے جب تک عورتوں کی صحیح قدر و قیمت کا احساس نہیں ہوگا،

حیاتِ ملّی نامکمل رہے گی۔ اہل وعیال کی پرورش میں عدل وانصاف پر عمل کرنا چاہیے اس لیے تین چیزیں ہیں جن میں مساوات ناگزیر ہے۔ طلاق میں، علیحدگی (خلع) میں، وراثت میں، جب تک وراثت میں عورت کو مرد کا نصف اور رواج میں چوتھائی قرار دیا جاتا ہے۔ عائلہ کا درجہ بلند نہیں ہوگا، نہ ملک کا۔ ہم نے دوسرے حقوق کے لیے عدالتیں کھول رکھی ہیں لیکن عائلہ کی زمام مذاہب فقہ کے ہاتھوں میں دے دی ہے۔ میں نہیں سمجھتا ہم نے عورتوں کو کس لیے بے بس چھوڑ رکھا ہے۔ کیا وہ ملک کی کوئی خدمت بجا نہیں لاتیں۔ یا پھر ہم چاہتے ہیں اس کی سوئی ایک تیز سنگین میں بدل جائے۔ وہ ایک انقلاب برپا کر دے اور اپنے حقوق ہمارے ہاتھوں سے چھین لے؟"

قانون وراثت

جدید ترکی کا یہ انقلاب پسند شاعر قانون وراثت میں ایک لڑکی اور لڑکے کے حصوں کی برابری کا خواہاں ہے، حالانکہ قرآن نے نصِ قطعی کی رُو سے لڑکے سے لڑکی کا حصّہ نصف قرار دیا ہے:

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ
حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ (۴ : ۱۱)۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے میت کے ترکے میں اس کی اولاد کا

حصہ اس طرح متعین ہے کہ ایک لڑکا دو لڑکیوں کے برابر
ہوتا ہے۔

قرآن اس صورت میں حصوں کے واضح تعین کے بعد اس تعین کو حدود اللہ قرار دیتا ہے چنانچہ ارشادِ باری ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ (۴ : ۱۳-۱۴)

ترجمہ: یہ اللہ کی جانب سے مقررہ حدود ہیں، جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرے گا۔ اللہ اُسے جنت میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ وہاں ہمیشہ رہے گا، اور یہ بڑی کامیابی ہوگی۔ اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت نہیں کرے گا اور حدود اللہ کو توڑے گا، اللہ اُسے دوزخ میں داخل کرے گا، وہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اُسے سخت عذاب ہوگا۔

اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں، کہ اس تخصیص کو ترکی کا شاعر علمار کی مفسرانہ ٹھوکر کیوں قرار دے رہا ہے۔ وہ کھل کر قرآن کے اس فیصلے کو ناانصافی کیوں قرار نہیں دیتا محض اس لیے کہ اس طرح وہ اسلام کے دائرہ سے نکل جاتا ہے اور اس کی بحث کے زاویے بدل جاتے ہیں۔ علامہ مرحوم نے اس شاعر کے اس مطالبہ کے متعلق جو لکھا ہے وہ قابل مطالعہ ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"رہا ترکی شاعر کا مطالبہ سو میں سمجھتا ہوں وہ اسلام کے قانون وراثت سے کچھ بہت زیادہ واقف نہیں۔ وہ نہیں سمجھتا کہ قرآن پاک نے وراثت کے بارے میں جو قاعدہ نافذ کیا ہے، اس کی معاشی قدر و قیمت کیا ہے۔ شریعت اسلامی میں نکاح کی حیثیت ایک عقد اجتماعی کی ہے اور بیوی کو حق حاصل ہے کہ بوقتِ نکاح شوہر کا حقِ طلاق بعض شرائط کی بنا پر خود اپنے ہاتھ میں لے لے۔ یوں امر طلاق میں تو مرد و زن کے درمیان مساوات قائم ہو جاتی ہے۔ رہی وہ اصلاح جو شاعر نے قانونِ وراثت میں تجویز کی ہے۔ سو اس کی بنا غلط فہمی پر ہے اگر قانوناً ان کے حصوں میں مساوات قائم نہیں کی گئی تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے، اس لیے کہ یہ خیال تعلیماتِ قرآنی کے منافی ہے۔ قرآن مجید کا

صاف اور صریح ارشاد ہے، ولھن مثل الذی علیھن (۲ : ۲۲۸)
لہٰذا لڑکی کا حصّہ متعین ہُوا تو کسی کمتری کی بنا پر نہیں بلکہ ان فوائد کے
پیشِ نظر جو معاشی اعتبار سے اسے حاصل ہیں۔ علی ہذا اس مقام کا
لحاظ رکھتے ہوئے جو اس ہیئت اجتماعیہ میں جس کا وہ خود بھی ایک
حصّہ ہے، اسے دیا گیا۔ پھر[1] شاعر کا اپنا خیال بھی تو یہی تھا کہ مسئلۂ
وراثت کو تقسیم دولت کے ایک الگ تھلگ جزو کی حیثیت سے
دیکھنے کی بجائے منجملہ ان عوامل کے تصور کرنا چاہیے۔ جن کی غرض و
غایت ایک ہے۔ شریعتِ اسلامیہ کی رو سے لڑکی اس سارے جہیز
کی خود ہی مالک ہے جو اسے والدین سے ملتا ہے، اور مہر کی بھی جسے
اس کی مرضی کے مطابق موجل بھی ٹھہرایا جا سکتا ہے اور غیر موجل بھی
اور جس کی ادائیگی تک وہ خاوند کی ساری جائداد مکفول رکھ سکتی ہے۔
اس کے کفاف کی ذمہ داری بھی تاحینِ حیات خاوند پر رہتی ہے۔ اب

---

[1] جب اقبال کے پیرو اقبال کی اس تنقید کو نظر انداز کر کے مسئلہ کی ابتدائی
صورت ہی کو پیشِ نظر رکھتے ہیں تو اقبال کا صحیح مسلک ان
کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

مؤلّف

اگر اس نقطۂ نظر سے قانونِ وراثت کا جائزہ لیجیے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسلام نے لڑکوں اور لڑکیوں کی معاشی حیثیت میں کوئی فرق نہیں کیا۔ برعکس اس کے ان کے سہام میں جو عدم مساوات نظر آتی ہے وہی ان کی مساوات کا ذریعہ بن جاتی ہے جس کا شاعر نے مطالبہ کیا ہے!![1]

ہمارے نزدیک علامہ کے بیان کردہ نکات کے علاوہ یہ نکتہ بھی اس ظاہری عدم مساوات کو سمجھنے کے لیے قابلِ توجہ ہے کہ فطرت کے قوانین کے نتیجے میں اور نسلِ انسانی کے تحفظ و بقا کے لیے لازماً اپنے والدین کے گھر سے رخصت ہو کر نیا گھر بسانا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے والدین کی ذمہ داریاں ان کے معاشی تعلقات کی بنا پر زندگی کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی لین دین کی صورتوں کا پورا کرنا لڑکی کے ذمہ نہیں (اخلاقی یا قانونی طور پر) لگایا جا سکتا۔ ان سے عہدہ برآ ہونا لڑکوں کا کام ہوتا ہے۔ لہٰذا اس رو سے بھی قرآن نے ایک لڑکی کو لڑکے کے برابر کا حصّہ نہیں دلایا۔ علاوہ ازیں بالعموم بالغ لڑکے اپنے والد کے ساتھ کمائی میں برابر کے شریک ہوتے ہیں اور لڑکیاں ان سے کمتر درجہ ہی کی امداد کر سکتی ہیں لہٰذا

---

[1] ترجمہ خطباتِ اقبال تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ص ۲۶۳۔

قانونی تقسیم میں یہ بظاہر عدم مساوات لازمی ٹھہرتی ہے۔ ضیاء کے خیالات پر تنقید کرنے کے بعد حضرت علامہ فرماتے ہیں:

قوانین وراثت کا بغور مطالعہ

"دراصل قرآن مجید کے قانونِ وراثت کی تہ میں جو بقول فان کریمر شریعت اسلامیہ کی ایک نہایت ہی اچھوتی شاخ ہے، جو اصول کام کر رہے ہیں ان پر مسلمان ماہرین قانون نے ابھی تک کماحقہٗ توجہ نہیں کی۔ ہمیں چاہیے اس بڑے تلخ طبقاتی نزاع سے جو آج کل کے معاشرے میں جاری ہے سبق حاصل کریں۔ میرا خیال ہے کہ جہاں ہم نے اپنی شریعت کا مطالعہ اس انقلاب کے پیشِ نظر کیا جو معاشیات کی دنیا میں ناگزیر ہے تجھیں اس کے بنیادی اصولوں میں بعض ایسے پہلو نظر آجائیں گے جو آج تک ہم پر منکشف نہیں ہوئے۔ پھر اگر ایمان و یقین سے کام لیا گیا تو ان میں جو حکمت پوشیدہ ہے۔ ہم اس سے اور زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے"۔

ان سطور سے بظاہر ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ اسلامی قوانین وراثت میں بھی معاشی دنیا کے انقلابات کی روشنی میں تبدیلی ہو سکنے کی گنجائش ہے۔ ہم وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس سے علامہ کا اصل مقصود کیا ہے۔ کیا وہ معاشی انقلاب کی روشنی میں

نص کا منشا و مقصود تبدیل کرنا روا سمجھتے تھے ؟

اور جب علامہ ترکی کی بیداری کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں تو ان سے اس غلط فہمی کو اور تقویت ملتی ہے ۔

ترکوں کی بیداری

"دراصل یہ صرف ترک ہیں جو امم اسلامیہ میں قدامت پرستی کے خواب سے بیدار ہو کر شعورِ ذات کی نعمت حاصل کر چکے ہیں ..... آج جو مسئلہ ترکوں کو درپیش ہے کل دوسرے بلادِ اسلامیہ کو پیش آنے والا ہے اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی قانون میں کیا فی الواقع مزید نشو و نما اور ارتقاء کی گنجائش ہے ۔ لیکن اس سوال کے جواب میں ہمیں بڑی زبردست کاوش اور محنت سے کام لینا پڑے گا ۔ گو ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ اس کا جواب اثبات ہی میں دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہم اس مسئلے میں وہی رُوح برقرار رکھیں جس کا اظہار کبھی حضرت عمرؓ کی ذات میں ہوا تھا ۔ وُہ امت کے اولین دل و دماغ ہیں جو ہر معاملے میں آزادیٔ رائے اور تنقید سے کام لیتے تھے ۔ اور جن کی اخلاقی جرأت کا یہ عالم تھا کہ حضورؐ رسالت مآب صلعم کی حالت نزع میں کہہ دیا کہ ہمارے لیے اللہ کی کتاب ہی کافی ہے"[1]

---

[1] ترجمہ خطبات ص ۲۵۱ منکرین حدیث اس قول کو بار بار دہراتے ہیں ۔

ان سطور کو پڑھ کر ایک قاری یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ علامہ کے نزدیک ترکوں کی آزادی ہر حیثیت سے خوش آئند ہے۔ نیز وہ قرآن کے علاوہ کسی اور ماخذ کو قانون کی اساس قرار دینا نہیں چاہتے۔ حالانکہ علامہ کا مسلک یہ نہیں ہے۔ اگرچہ وہ اجتہاد کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ انھوں نے ترکوں کی آزادی افکار پر کڑی تنقید کی ہے۔ اسی خطبے میں انھوں نے ضیا کے افکار پر کاری ضرب لگائی ہے اور آزادی افکار کی تحریک کو حدود کے اندر رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔

محولہ بالا سطور کے فوراً بعد لکھتے ہیں "بہر حال ہم اس تحریک کا جو حریت اور آزادی کے نام سے عالم اسلام میں پھیل رہی ہے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیے۔ آزاد خیالی کی یہی تحریک اسلام کا نازک ترین لمحہ بھی ہے۔ آزاد خیالی کا رجحان بالعموم تفرقہ اور انتشار کی طرف ہوتا ہے..... اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ ہمارے مذہبی اور سیاسی رہنما حریت اور آزادی کے جوش میں بشرطیکہ اس پر کوئی روک عائد نہ کی گئی، اصلاح کی جائز حدود سے تجاوز ہی کر جائیں"[1]

---

[1] ترجمہ خطبات ص ۲۵۲

وضاحت اب علامہ کا مطلب واضح ہے۔ گذشتہ صفحات میں قوانینِ وراثت کی بحث کے ضمن میں ان کے افکار سے یہ شائبہ پیدا ہوتا تھا کہ وُہ حالات کی روشنی میں نص کی تنسیخ کو بھی روا رکھتے ہیں۔ اس کی وضاحت ملاحظہ ہو۔

اجماع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لیکن اس سلسلہ میں دو سوال جواب طلب ہیں ایک تو یہ کہ اجماع کیا قرآن مجید کا بھی ناسخ ہے؟ ایک اسلامی مجلس میں تو یہ سوال اُٹھانا ہی غیر ضروری ہے لیکن ہم یہ سوال اُٹھا رہے ہیں تو محض اس غلط بیانی کے پیشِ نظر جو ایک مغربی نقاد نے اپنی تصنیف "اسلامی نظریہ ہائے مالیات" میں کی ہے، جسے جامعہ کولمبیا نے شائع کیا اس کتاب کے مصنف نے بغیر کوئی سند پیش کیے ہوئے یہ لکھ دیا ہے کہ احناف اور معتزلہ کے نزدیک اجماع قرآن مجید کا بھی ناسخ ہے حالانکہ اسلامی فقہ میں اس قسم کی غلط بیانی کی تائید میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ مثال کبھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ نہ حدیث میں ہمیں اس طرح کا کوئی اشارہ ملتا ہے ....."

گویا علامہ کے نزدیک کوئی قانونی ضرورت قرآن کی ناسخ نہیں ہو سکتی، اب ان کے افکار کی رو سے ان قوانین وراثت کی تبدیلی کا امکان

کیسے نکل سکتا ہے جن کا تعین قرآن کی نصوص کی رُو سے کیا گیا ہے؟

حدیث کے ایک اشارے کی اہمیت

محولہ بالا سطور سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ علامہ کے نزدیک احادیث کا ایک اشارہ بھی بڑی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ لہٰذا ان کا منشا ماسبق بحث میں صرف یہ ہے کہ ہمیں اجتہاد سے کام لینا چاہیے۔ اور اس مشکل کام میں قوانینِ اسلامی کے ماخذ کا مطالعہ گہری نظر اور بالغ نگہی سے کرنا چاہیے: تاکہ جدید حالات اور انقلابات کے تقاضے اسلامی حدود کے اندر رہ کر پورے ہوسکیں۔ اس مسئلے میں وہ جس روح کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ وُہ حضرت عمرؓ کی پیروی میں بظاہر ایسی نظر آتی ہے، کہ اس سے مُراد احادیث سے بے نیازی ہے لیکن صحیح صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔

علامہ کا صحیح مفہوم

ان کی مراد یہ ہے کہ اجتہاد کی گنجائش پر سوچ بچار کرتے وقت ایک مسلمان کو بڑی دشواریوں سے، عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔ کہ کیا اسلامی قانون میں فی الواقع مزید نشوونما کی گنجائش بھی ہے۔ ان کے نزدیک اس کا جواب اثبات میں ہے تو اس کے بعد جو روح برقرار رکھنی پڑے گی وُہ تنقید اور جرح کی روح ہے جس کا

اظہار حضرت عمرؓ کی ذات میں ہوتا رہا ہے۔ اس تنقید کے بڑے فائدے ہیں اسی کی بدولت صحیح طریق کار متعین ہوتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اس تنقیدی روح والی ایک مکمل شخصیت کے متعلق یہ کہا ہے کہ ان کی تنقیدی جرأت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے جناب رسالت پناہؐ کی حالتِ نزع میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ ان سطور سے حضرت عمرؓ کی تنقیدی روح کا اظہار کرنا مقصود ہے۔ قرآن اور حدیث کا مقابلہ کرانا مقصود نہیں ہے۔ ماسبق دو تین سطروں کو دقتِ نظر کے ساتھ دیکھنے سے ہمارا یہ استدلال، ایک صاحب نظر قاری کو قائل کر سکے گا۔

ایک سوال تاہم یہاں یہ سوال پیدا کیا جا سکتا ہے کہ یہ رائے اقبال کی نہ سہی حضرت عمرؓ کی تو ہے ہی۔ اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا ارشاد سنت رسول اللہؐ سے بے نیازی اور اعراض کا اظہار نہیں ہے۔ اس وقت شہرت یافتہ مکتوب ہدایت نامے کے طور پر صرف ایک کتاب اللہ ہی موجود تھی۔ لہٰذا اس سے رجوع کرنے کا اظہار حضرت رسالت پناہؐ کی سنتِ جاریہ سے رجوع کا نقیض نہیں ہو سکتا تھا حضرت عمرؓ اگر احادیث سے بے نیازی کے دعویدار ہوتے تو اُن

سے کوئی حدیث مروی نہ ہوتی حالانکہ احادیث کے مستند مجموعوں میں ان کی روایتوں کی تعداد ۵ سے زاید ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ روایات ان کی نہیں ہیں خواہ مخواہ ان کے ذمے لگا دی گئی ہیں، تو اسے اس امر کا ثبوت دینا ہوگا۔ اور جب تک صحابہ کی ایک معتبر اور کثیر تعداد کو (نعوذ باللہ) منافق نہ قرار دیا جائے اس باطل دعویٰ کا اظہار ہی ممکن نہ ہوگا، اور جو معترض صحابہؓ کو منافق ٹھہرائے گا۔ اسے حضورؐ کی تعلیم و تربیت کو بدرجہ اولیٰ ناقص اور بے اثر تسلیم کرنا ہوگا۔ اور جب کوئی حضورؐ کی تعلیم کو بے اثر اور ناقص قرار دے دے گا، تو خود حضورؐ کی ذات بابرکات کی کوئی اہمیت اس کی نظر میں نہیں ہوگی ظاہر ہے کہ یہ معترض دائرہ اسلام میں کیسے رہ سکتا ہے۔

علاوہ ازیں حضرت عمرؓ کے اس جواب کا علم معترض کو کن ذرائع سے ہوا ہے؟ اس کا جواب ظاہر ہے کہ اس اطلاع کا ماخذ ہی حدیث ہے۔ اب ہم اس اطلاع کو تو صحیح تسلیم کر دیں۔ اور جس مجموعے سے ہمیں یہ اطلاع ملی ہے اس مجموعے کی دوسری اطلاعات کو غیر مستند اور غیر صحیح قرار دیں تو رد و قبول کی یہ روش کس منطق کی رو سے درست ہوگی۔

ایک ضمنی بحث

رحلت کے وقت حضورؐ کا کاغذ طلب کرنا | حضرت مجدد الف ثانیؒ

نے حضورؐ کے کاغذ طلب کرنے کے واقعہ پر مفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ درجِ ذیل ہے۔ خواجہ ابوالحسن بدخشی کشمی کی طرف لکھتے ہیں:

"حضرت رسالت خاتمیت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مرضِ موت میں کاغذ طلب کیا اور فرمایا:

اِئْتُوْنِیْ بِقِرْطَاس اَکْتُبُ کِتَابًا لَّنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ (بخاری)

کاغذ لاؤ کہ میں کچھ لکھ دوں تاکہ تم میرے بعد گمراہ نہ ہو جاؤ۔

اور حضرت فاروقؓ اور چند اصحاب نے توقف کیا، اور کہا کہ:

حسبنا کتاب اللہ (ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے)

اور کہا:

اَھَجَرَ اِسْتَفْھِمُوْہُ؟

کیا آپؐ غشی کی حالت میں ایسا فرما رہے ہیں، اچھی طرح پوچھ لو۔

حضرت فاروقؓ کا توقف ردوانکار کے باعث نہ تھا۔ پناہ بخدا ایسے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وزیروں اور ہم نشینوں سے جو خلقِ عظیم کے ساتھ متصف تھے۔ اس قسم کی بے ادبی کیسے ہو

سکتی ہے حضرت فاروقؓ کا مطلب استفہام و استفسار سے یہ تھا کہ اگر کوشش و اہتمام کے ساتھ کاغذ طلب فرمائیں تو لا یا جائے۔ اگر آپ اس بارہ میں کوشش نہ فرمائیں تو ایسے نازک وقت میں آپؐ کو تکلیف نہ دی جائے کیونکہ اگر وحی اور امر سے آپ نے کاغذ طلب فرمایا ہے، پھر تو تاکید اور مبالغہ سے کاغذ طلب فرمائیں گے اور جو کچھ حکم ہوگا لکھیں گے۔ کہ وحی کی تبلیغ نبی پر واجب ہے، اگر یہ مطلب امرِ وحی سے نہیں ہے، بلکہ چاہتے ہیں کہ فکر و اجتہاد کی رُو سے کچھ لکھیں تو وقت یاوری نہیں کرتا کیونکہ پایۂ اجتہاد آپؐ کے رحلت فرما جانے کے بعد بھی باقی ہے، آپؐ کی امت کے مستنبط اور مجتہد لوگ کتاب اللہ سے جو دین کا اصل و اصول ہے، احکامِ اجتہادیہ نکال لیں گے جب حضورؐ نے اس بارہ میں اہتمام نہ فرمایا تو معلوم ہوا کہ آپؐ کا ارشاد وحی کی رُو سے نہیں تھا۔ وہ توقف جو مجرد استفسار کے لیے ہو مذموم نہیں ہے۔ ملائکہ کرام نے حضرت آدمؑ کی خلافت کی وجہ اللہ سے دریافت کی حضرت زکریاؑ نے حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کی خوشخبری کے وقت حیرانی کا اظہار کیا۔ حضرت مریمؑ نے عیسیٰؑ کی پیدائش کے بارے میں وحی پا کر کہا:

أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي
بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ۝ (آیہ مریم)

میرے ہاں کس طرح لڑکا ہوگا؟ جب کہ مجھے کسی بشر
نے ہاتھ نہیں لگایا اور میں بدکار بھی نہیں ہُوں۔

اگر حضرت فاروقؓ نے بھی استفسار اور استفہام کے لیے کاغذ کے لانے میں توقف کیا تو کیا مضائقہ ہے[1]"۔

حضرت فاروقؓ نے اس وقت احادیث سے زیادہ اہم مجموعہ ہدایات کا ذکر اس لیے بھی کیا ہوگا کہ اُن کے نزدیک قرآن سے مراد وُہ حروف اور الفاظ کا مجموعہ نہیں ہے جسے ہر کوئی اپنی مرضی سے معنی پہنا تا رہے۔ بلکہ وہ مجموعہ ارشادات ہے جس کا اصل مفہوم انھوں نے حضرت رسالت مآبؐ سے سمجھا تھا۔

انداز گفتگو

ویسے بھی گفتگو کے دوران میں ایک زیادہ اہم شے کا ذکر خواہ اس کو منفرد کر کے ہی کیا جائے۔ اس شے سے کمتر شے کے وجود اور اہمیت کی نفی نہیں کرتا۔ اسی طرح ایک کم اہم چیز کا نمایاں بیان اس امر کا مقتضی نہیں ہوتا کہ زیادہ اہم شے سے اعراض کرنا ہی مقصود ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر

---

[1] رفعا صدیم مکتوب ۔ ص ۹۶ ۔ دفتر دوم

میں حضرت صدیقؓ کے عشقِ رسولؐ کا ذکر کیا ہے:

؎ پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

یہاں صرف رسولؐ کا ذکر ہے۔ کیا اس سے یہ معنی نکل سکتے ہیں؟ کہ ایسا کہنے والا اپنے تعلق کو رسولؐ کی ذات تک ہی رکھ رہا ہے اور خدا سے بے نیازی کا اظہار کر رہا ہے۔ اب ہم اصل بحث سے شروع کرتے ہیں:

سرقہ

قرآن نے چوری کرنے والے مرد یا عورت کی سزا ہاتھ کاٹنا قرار دی ہے۔ اور صرف یہی واحد سزا شریعت اسلامیہ کی رُو سے سزا ہے۔ اس میں ترمیم کرنا نص کے حکم قطعی کو چیلنج کرنا ہے قرآن کے جن ضوابط پر مغرب کے اہل علم نے اعتراضات کیے ہیں ان میں سے ایک یہ حد بھی ہے، اسے بغایت درجہ وحشیانہ اور انسانیت سوز قرار دیا ہے۔ اور اس پروپیگنڈے کے زیر اثر چند مسلمان مفکرین کی بھی نئی روشنی میں یہی رائے ہے کہ اگر یہ حد جاری کر دی جائے گی تو اسلامی معاشرے میں (سزا یاب) ہاتھ کٹے نہایت کریہہ منظر پیش کریں گے۔ اور یوں صفائی کا یہ مظاہرہ اسلام کو بدنام کر دے گا۔ علاوہ ازیں ہاتھ کٹا (چور) معاشرے کے لیے ایک

مستقل بوجھ بن جائے گا۔ یہ سزا عرب کے اُس وقت کے حالات کے مطابق درست ہوگی مگر جدید نظریات اور ترقی یافتہ اقوام کے قوانین کے پیش نظر درست نہیں ہے۔

یہ نظریات، بہ ظاہر نہایت خوش کن اور رحم وکرم پر مبنی نظر آتے ہیں لیکن غور سے دیکھنے پر یہ معلوم ہوگا کہ اس سزا کے اندر جو مصلحت کارفرما ہے وہ کسی طرح بھی نظر انداز نہیں جا سکتی۔ اسلام سب سے پہلے ایک متوازن معاشرے کو جنم دیتا ہے، ہر کسی کے لیے زندہ رہنے کے لیے برابر کے مواقع پیدا کرتا ہے۔ ظالم کو ظلم سے روکتا ہے۔ مظلوم کو اس کا حق دلاتا ہے اور اس کے بعد اسلامی قوانین کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ اب ایک شخص اس متوازن اور استوار نظام کو توڑنے کے لیے اگر کوئی قدم اُٹھاتا ہے تو اُس کی جسارت بے جا کو کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے۔ جب سزا کے طور پر ایک، دو چوروں کے ہاتھ کاٹ دیے جاتے ہیں تو چوری کا نام ونشان تک باقی نہیں رہتا۔ دوسرے بدقماش افراد اس سزا سے ایسی عبرت پکڑتے ہیں کہ دینی قانون کو توڑنے سے پہلے اُس کا انجام نظر آجاتا ہے۔ قانون کو توڑنے سے پہلے اُس کا انجام ہی تو ہوتا ہے جو جرم پر اُکساتا ہے یا باز رکھتا ہے۔ جب ایک مجرم یہ سمجھتا ہے کہ قانون کی

فلاں فلاں چول ڈھیلی ہے، وہاں سے یوں مدد مل سکتی ہے۔ یہاں سے یوں بات بن سکتی ہے۔ جیل کے اندر رہ کر آخر کیا ہوگا۔ تو اس انجام کے خیال سے جرم کرنے پر اس کی طبیعت میں دلیری پیدا ہو جاتی ہے، اس کے برعکس سزا کی عبرت ناکی، منصفوں کی انصاف پسندی، رشوت اور سفارش کی بے اثری اس کے جرم کو اس کی اپنی نظروں میں بھیانک بنا دیتی ہے۔ اس طرح فرد فرد کے اندر ایک پہریدار مقرر ہو جاتا ہے، جو اسے جرم کرنے سے پہلے ہی روک لیتا ہے۔ اسلام نے جرم کرنے کے دروازوں کو بند کرنا چاہا ہے جب کہ موجودہ قوانین جرم ہو جانے کے بعد اس کا مداوا کرنے کے درپے ہیں۔ اس کے برعکس اگر جدید نظریات کی روشنی سے آنکھیں خیرہ ہونے پر آمادہ ہوں۔ کچے پکے اعتراضات سے خوف کھا کر اور وحشت و بربریت میں مہارت تامہ رکھنے والی اقوام کی زبانی زبانی رحم پروری کی قراردادیں سن کر ہم اس اسلامی حکمت کو خیرباد کہہ دیتے ہیں جو اس حد کے اندر مستور ہے تو اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ سارا معاشرہ اطمینان سے بے نصیب ہو جاتا ہے۔

ہم اس سے بخوبی واقف ہیں کہ انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والوں کی نظر چور کے فعل پر ہی نہیں ہونی چاہیے، بلکہ انھیں چور کے

پیٹ کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ معاشرے کے اس نظام کو بھی دیکھنا چاہیے جو ایک بھلے مانس کو چور بن جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ سب درست لیکن اس سے یہ نتیجہ قطعاً نہیں نکل سکتا کہ چور کی سزا میں ہی ہم اپنی مرضی سے ایسی ترمیم کر لیں جو نص کے خلاف پڑتی ہو۔ اس سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اصلاح پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرے کو درست کر کے اسلامی قوانین کے نافذ کرنے کے لیے ماحول کو سازگار بنایا جائے اور اس کے بعد مجرم کو صحیح سزا دی جائے۔

زنا اسلام نے مباح کاموں کا دائرہ مناسب حد تک وسیع رکھا ہے اس دائرے کو اس کی مقررہ وسعتوں تک برقرار رکھنے کے بعد زنا کا ارتکاب کرنے والوں پر حد جاری نہ کرنا اسلام کے ضابطہ کے لیے تباہی لانا ہے۔ محصن اور غیر محصن کی تمیز کر کے اسلام نے حد میں جو امتیاز رکھا ہے اس میں بڑی حکمت اور معاملہ فہمی ہے۔ جس تہذیب میں زن و مرد کی باہمی رضا کے طور پر بدی کے اس فعل کو قانون کی گرفت سے آزاد سمجھا جاتا ہو وہاں اس جرم کی صحیح صحیح سزا کا بیان ایک مضحکہ ہی ہو سکتا ہے۔ اپنی آزاد مرضی سے ایک عورت اور ایک مرد بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو اس کی حمایت میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس فعل

کا بُرا ہونا تو تب ہے کہ طرفین میں سے کسی ایک کی رضا مفقود ہو ورنہ اس کی بُرائی کوئی برائی ہی نہیں ہے. نفسیات کے عالم کالج کے طلبہ کے سامنے حسین اور دلپذیر دلائل کی رُو سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ انسان کے اندر جب کسی کام کو کرنے کی شدید خواہش پیدا ہو جائے اور وہ اس خواہش کو سوسائٹی کے دباؤ کے زیر اثر یا کسی خوف کی بنا پر پورا نہ کر پائے تو یہ خواہش اس کے لاشعور میں چلی جاتی ہے اور اس کے مستقل دبائے رکھنے سے انسان کی صحت پر نہایت بُرے اثرات ثبت ہوتے ہیں۔ وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کو اپنی خواہشات کے پورا کرنے کے پورے پورے مواقع دینے چاہئیں۔ اسی طرح ایک صحت مند معاشرہ پیدا ہو سکتا ہے۔

ان مواعظِ خبیثہ کا اثر اس کے سوا اور کیا ہے کہ جوانوں کو زنا کرنے پر اور سائنٹیفک لائنوں پر بے حیائی کو رائج کرنے پر اکسایا جا رہا ہے۔ جب ایک نوجوان اس طرح کی معلومات فراہم کر لیتا ہے، تو اس کے اندر کا شیطان زیادہ قوی ہو کر اس کے اعصاب پر مکمل تسلّط جما لیتا ہے اور برتھ کنٹرول کے جدید طریقے اور ان کے رواج کی سرکاری حمایت اور ان کے نتیجے کے طور پر ابدی خوشحالی کی ضمانت، شیطان کی اس حکومت کو مستحکم سے مستحکم تر کر دیتی ہے۔ اب منبر پر لاکھ پکارا

جائے ۔ اخلاق کے سینکڑوں درس دیے جائیں سب اکارت جائیں گے ۔ اسلامیات کا استاد اپنے رنگ میں جوان طلبہ کو سمجھانے کے لیے جو چاہے کیا کرے، اُس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا سنیما کے باہر دیواروں پر اچھی تختوں پر قد آدم نیم عریاں تصاویر ایک نظر دیکھ لینے کے بعد اس دور کا نوجوان پورے دِن کے لیے دانائی کی کسی بات کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھتا ہے ۔ ہمارے ارباب بست و کشاد نے جوان دل و دماغ کے لیے جو غذا مہیا کر رکھی ہے ۔ اس کے فاسد اثرات سے بچنا نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا ہے:

درمیان قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش!

اب ایسے معاشرے میں اگر زنا رواج پائے تو حسبِ حال رواج پائیگا ۔ اس کی تشریف آوری غیر متوقع نہیں بلکہ درخت کے ثمر کے طور پر ہو گی ۔ عصمت فروشی کے اڈے اگر فروغ پاتے ہیں تو اس کی ذمہ داری اس نظام پر ہے جو ان کو پیدا کرنے اور بڑھانے میں مدد دیتا ہے ۔ عصمت فروشی کو بند کرنے کے لیے کبھی کبھار اِدھر اُدھر سے ایک آدھ آواز سنائی دیتی ہے ۔ نہ ہونے سے اس کا ہونا بہتر ہے

لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ایک طرف تو ہم اپنی تعلیم، تفریح اور تبلیغ کی بدولت بدکاری کے شعلوں پر پٹرول ڈال رہے ہیں، اور دوسری طرف دامن صد چاک لیے ان فلک بوس شعلوں کے بجھ جانے کے خواہش مند بھی ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہماری یہ خواہش ہمارے قلب و نظر کی صحیح ترجمان ہے یا ہمارا یہ فعل ہماری شخصیت کی نمائندگی کر رہا ہے جو ان شعلوں کو زندہ رہنے کی قوت دے رہا ہے۔

ماحول بدل چکا ہے، مگر زندگی اور فطرت کی بنیادی حقیقتیں بدستور غیر متبدل اور غیر متغیر حالت میں ہیں۔ اسلامی سزائیں فطرت کے عین مطابق ہیں۔ آج یہ سزائیں اگر فطرت کے خلاف نظر آتی ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے اندر سقم ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے شادی بیاہ کی جو سہولتیں پیدا کی تھیں ہم نے ان کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ ہم نے ان میں بے جا سختی اور تکلف کو داخل کر کے ایک حد تک شادی کو زندگی کا روگ بنا دیا ہے۔ جس کے گھر ایک لڑکی پیدا ہو جائے اُس کے لیے اُس لڑکی کی شادی کے اخراجات برداشت کرنا اور عزت کے ساتھ اس دشوار گزار گھاٹی سے پار اتر جانا جان جوکھوں کا کام ہو گیا ہے۔ ایک مرد کو بیوی لا کر گھر بنانے اور نئے

فیشنوں کے حق ادا کرنا جتنا مشکل ہے، اُس کا اندازہ کچھ اہلِ دل ہی کر سکتے ہیں۔ رشوت ستانی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ملازم پیشہ لوگ اپنی بیگمات کے مطالبات کو جائز ذرائع سے پورا ہی نہیں کر سکتے۔

ان تقاضوں کی وجہ سے شادی کا مناسب وقت ہو چکنے کے باوجود اس رسم کے سرانجام دینے میں غیر معمولی التوا پیدا کرنا ناگزیر ہو گیا ہے اور اس عبوری دور میں جوان آدمی کیا کچھ نہیں کرتا جب اس کے چاروں طرف دعوت نظارہ، صنم کدے رقصاں ہوتے ہیں۔ وہ اس رقص کی داد نہ دے گا تو اور کیا کرے گا۔ ایک شادی کے بعد بدقسمتی سے یا حسن اتفاق سے مرد کی ضروریات اس قسم کی ہوں کہ وہ اِس شادی سے تسکین نہ پا سکتا ہو، نیز اُس کے لیے قانون نے شرافت کے ساتھ قسمت آزمائی کی راہیں بند کر دی ہوں، تو وہ نہایت شریفانہ روش اختیار کر کے گرل فرینڈز رکھ سکتا ہے۔ شیشہ کلبوں میں داد عیش دے سکتا ہے۔ چاہے اس عیش کے لیے اسے ڈاکہ ڈالنے کی ضرورت پیش آئے، یا مدک فروشی کا کاروبار چلانا پڑے۔ اس کے اس طرزِ عمل کو موجودہ سوسائٹی ناپسند نہیں کرے گی۔ زیادہ سے زیادہ اُسے آزاد منش جوان قرار دیا جائے گا اس کے برعکس اگر وُہ دوسری بیوی گھر لے آئے۔ تو اس کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

اس مذہب کو جو دوسری شادی کی اجازت دیتا ہے۔ وقیانوسی قرار دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرے کے حالات ایسے ہوں اور جس نظام میں بدی کرنے کی سہولت اس درجہ ہو اور نیکی کے راستے میں کانٹے اور اوگھٹ گھاٹیاں پڑتی ہوں وہاں خیر و شر کی حکمت میں الجھنا نادانی نہیں تو اور کیا ہے!

کہا جاتا ہے کہ معاشی حالات کی رُو سے بھی اب ایک مرد کے لیے ایک سے زائد بیویاں رکھنا درست نہیں رہا۔ لہٰذا ریاست کو اس پر پابندی لگانے کا حق حاصل ہے۔ گویا پابندی یا اجازت، کی اساس معاشی حالات پر ہے۔ فرض کیجیے کل معاشی حالات ایسے ہو جائیں کہ ایک مرد کے لیے ایک بیوی کا رکھنا بھی مشکل ہو جائے تو کیا اُس وقت اس قسم کا ریاستی اجتہاد جائز ہوگا کہ دو مرد یا تین مرد مل کر ایک عورت رکھ سکتے ہیں یا سرے سے شادی کی ہی ضرورت نہیں ہے۔ آزادی کا زمانہ ہے جس کا جدھر سے جی چاہے اپنی تسلّی کے سامان پیدا کرتا پھرے۔ مرد بھی ریاست کے ہیں عورتیں بھی ریاست کی ہیں۔ تو کیا ایسا اجتہاد جو حالات کے دباؤ کے زیر اثر کیا جائے، اسلامی اجتہاد ہوگا اور ایسی تعلق داری اسلامی نکاح والی تعلق داری کہلا سکے گی؟ الامان! الامان!

شراب اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا ہے۔ اس کے نقصانات اس کے فوائد سے بڑھ کر ہیں، ہر نشہ آور شے اس حکم کی رُو سے حرام ہے۔ گویا حرمت کی علّت غائی نشہ آوری ہے کیونکہ نشہ کی بدمستی میں اسلامی اقدار کی برقراری جاتی رہتی ہے اور اخلاق کے دفترے ناب میں غرق ہو جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شرابی کو اگر شراب نشہ نہ دے اور وہ پی کر بھی بے حال نہ ہوتا ہو، تو شراب حرام نہیں رہتی، یہ تو اس کے لیے حرام ہے جو پی کر آپے سے باہر ہو جائے۔ نیز جدید طب اس کے استعمال کو اچھا قرار دیتی ہے اگر ہم نے دو ایک گھونٹ پی لیے تو کیا شور و شر ہے، للّا لوگ مفت کا جھگڑا کرتے ہیں۔ تمام ترقی یافتہ قومیں شراب پیتی ہیں، کیا ان تشریحات کی بدولت یا دوسری اقوام کی روش کی سند لا کر شراب کو جائز اور حلال کر دیا جا سکتا ہے؟ کیا ایسا فیصلہ اسلامی طرز فکر کی ہمنوائی کر سکتا ہے؟

سود اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے یعنی نص قطعی کی رو سے اس کا لینا دینا حرام ہے۔ اقتصادیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ سودی کاروبار کے بغیر ہمارے کام ہی نہیں چل سکتے۔ حکومت کا چلانا ہی مشکل ہو جاتا ہے، بنک بند ہو جاتے ہیں اور نظام درہم برہم ہو جاتا

ہے۔ کچھ عرصہ پہلے مصر کے علماء نے کافی بحث و مذاکرہ کے بعد بیمہ کمپنیوں کی پالیسیوں کی خاص صورتیں اس لیے متعین کرنے کی سفارش کی تھی، کہ اس طرزِ عمل سے سود کا احتمال نہیں رہے گا۔ مگر اس کے باوجود وہاں کے اجتماعی اسلامی ضمیر نے اس تبدیلی کو پسند نہیں کیا اور سودی کاروبار بدستور سودی کاروبار ہے اور اس کا ناجائز ہونا بدستور ناجائز ہے۔

ہمیں اپنے نظریات اور احکام کی روشنی میں بنک کاری کے جدید طریقے اختیار کرنے چاہئیں اور ماحول کے دباؤ سے سود کو جائز نہیں قرار دینا چاہیے جس کی حرمت نص کی رُو سے ہو اس میں تبدیلی کا مجاز کوئی نہیں ہے۔

زندگی کے متغیر حالات اور قانون سازی

اقبال نے ان خطبات میں صراحت کے ساتھ زندگی کے تغیر پذیر حالات کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کے تقاضوں کا قانون سازی سے جو تعلق ہو سکتا ہے۔ اس کی یوں وضاحت کی ہے۔

"لیکن پھر اس سلسلے میں غور طلب امر قرآن مجید کا وہ مطمح نظر ہے۔ جو اس نے زندگی کے بارے میں قائم کیا اور جس میں اس کی نگاہیں جمود

کی بجائے حرکت پر رہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جس کتاب کا مطمح نظر ایسا ہوگا اس کی روش ارتقار کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے؟ البتہ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے تو یہ کہ زندگی محض تغیر ہی نہیں اس میں حفظ و ثبات کا ایک عنصر بھی موجود ہے، بات اصل میں یہ ہے کہ انسان جب اپنی تخلیقی فعالیّت سے لطف اندوز ہوتا اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے نئے نئے جلووں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ تو اپنے انکشافِ ذات سے آپ ہی بے چین ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس ہر لحظہ آگے ہی آگے بڑھنے والی حرکت میں وُہ اپنے ماضی کو نظر انداز نہیں کر سکتا کیونکہ اسے اپنی وسعتِ ذات سے خوف اور وحشت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ وُہ دیکھتا ہے کہ اس پیش رس حرکت میں روحِ انسانی کو بعض ایسی قوتوں سے سابقہ پڑتا ہے جو اس کا راستہ روک لیتیں اور مخالف سمت میں کام کرتی نظر آتی ہیں۔ مگر پھر بھی اس بات کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں ادا کریں گے کہ زندگی چونکہ ماضی کا بوجھ اُٹھائے آگے بڑھتی ہے اس لیے ہمیں چاہیے جماعت میں تغیر و تبدل کا جو نقشہ ہم نے قائم کیا ہے، اس میں قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت اور وظائف فراموش نہ کریں، تعلیمات قرآنی کی یہی وہ جامعیت ہے جس کا لحاظ رکھتے ہوئے جدید عقلیت کو اپنے ادارات کا جائزہ

لینا ہوگا۔ دنیا کی کوئی قوم اپنے ماضی سے قطع نظر نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ یہ ان کا ماضی ہی تھا جس سے ان کی موجودہ شخصیت متعین ہوئی۔ پھر اسلام ایسے معاشرے میں تو پرانی تاسیسات پر نظر ثانی کا مسئلہ اور بھی نازک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے مصلحین کی ذمہ داریاں بھی ایک بڑی سنگین شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اسلام کی حیثیت لاجغرافی ہے اور اس کا مقصد ہے ایک ایسا نمونہ پیش کرنا جو انسانی اتحاد کی اس شکل کے لیے جو بالآخر ظہور میں آئے گی مختلف بلکہ یہ کہنا چاہیے باہمد گر حریف نسلوں کو اول دولتِ ایمان سے مالا مال کر دے اور پھر اس متفرق اور منتشر مجموعے کو ایک ایسی امت کی شکل دے جس کا اپنا ایک شعورِ ذات ہو۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ بایں ہمہ اسلام نے ان اداروں کے ذریعے جن کی تاسیس میں بڑی حکمت سے کام لیا گیا ہے۔ اتنی کامیابی تو ضرور حاصل کر لی ہے کہ اس کے مختلف الجنس پیروؤں میں کچھ نہ کچھ اجتماعی ارادہ اور اجتماعی ضمیر پیدا ہو گیا ہے۔ اس قسم کے معاشرے کے ارتقا میں تو بعض قواعد و ضوابط، مثلاً آدابِ اکل و شرب، یا احکام طہارت کا غیر متبدل ہونا بھی جو اجتماعی اعتبار سے بے ضرر ہیں۔ زندگی کے نقطۂ نظر سے بڑا قابلِ قدر ہے کیونکہ ان سے معاشرے میں ایک خاص قسم کا خلوص پرورش پاتا ہے

اور اس کے ظاہر و باطن میں ایک ایسی یکسانی اور یکرنگی پیدا ہو جاتی ہے جو تفریق و انتشار اور عدم مجانست (ہم جنس ہونے سے احتراز کرنا) کی ان قوتوں کا سدّ باب کر دیتی ہے جو ایک مرکب اور مخلوط معاشرے میں خوابیدہ رہتی ہیں۔ لہٰذا ان ادارات میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے معترضین کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے اجتماع انسانی کو جو شکل دینے کی کوشش کی ہے اس کا معنی و منشا فی الحقیقت کیا ہے۔ وہ اس کی ہیئت اجتماعیہ پر نظر ڈالیں تو اس لحاظ سے نہیں کہ اس سے بیشتر ایک معاشرہ کس ملک کو فائدہ پہنچتا ہے اور کس کو نہیں۔ بلکہ اس اعلیٰ مقصد کے پیش نظر جو ساری نوع انسانی کی زندگی میں رفتہ رفتہ اور بتدریج پورا کیا جا رہا ہے[1]

ترکی کے شاعر ضیاؔ نے مساوات مرد و زن کے پیش نظر اسلام کے قوانین میں جو تبدیلی کرنے کی خواہش کی ہے اور علامہ نے اس کے افکار پر تنقید کر کے اسلام کے مجتہدین کی جن کامیابیوں کی توقع کا اظہار کیا ہے۔ اس کا بغور مطالعہ کیے بغیر جیسا کہ گذشتہ اوراق میں لکھا گیا۔ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قرآن کی منصوص ہدایات میں بھی تغیر و تبدل کی گنجائش ہوگی لیکن جب ان

---

[1] خطبات اقبال ص ۲۵۷-۲۵۹

محولہ بالا سطور کو دیکھا جائے جن میں انھوں نے زندگی کے متغیر حالات اور قدامت پسند قوتوں کے فوائد کا بیان کیا ہے تو یہ شک و شبہ دُور ہو جاتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے علامہ کے پیروکاروں نے اس حصّے کو نظر انداز کر کے اُن کے صرف انہی نظریات کو اچھالنا شروع کر رکھا ہے جن کی رُو سے زندگی ہر لحظہ تغیر آشنا ہو رہی ہے اور یوں نئے قوانین اور اصلاحات کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے۔ اس طرح کا انداز فکر علامہ کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرتا ہے اور صحیح طریق کار متعین نہیں ہو سکتا۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ معاشی حالات کی تبدیلیاں تمام تر بیرونی اثرات و عوامل کی بنا پر معرضِ وجود میں نہیں آیا کرتیں بلکہ اس قوم کے ان روحانی اور اخلاقی نظریات کو بھی ان تبدیلیوں کے لانے میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ جو وہ زندگی کے بارے میں رکھتی ہے۔ اس نکتے کو نظر انداز کرنے سے کوئی خاطر خواہ اصلاح رُونما نہیں ہو سکتی۔ اگر محض متغیر حالات (سیاسی اور معاشرتی وغیرہ) کی للکار کو سن کر ہم اپنے قوانین میں تبدیلی کرنی شروع کر دیں گے تو ہمارے اسلام کی صورت مسخ ہو جائے گی اور ہم ہر حکم کو ہر قاعدے کو، ہر امر کو، ہر نہی کو محض وقتی سمجھ کر سارے نظام کو

تباہ و برباد کر دیں گے۔

کیا احکام وقتی ہیں؟

اگر احکام کو وقتی قرار دیا جائے، تو پھر ان کی عملی قدر و قیمت جاتی رہتی ہے جب کسی جرم کی سزا جو نص قطعی سے مقرر ہو، حالات کے بدلنے پر بدل سکتی ہے تو اس طرح قرآنی نصوص کی دوامی حیثیت بدل جائے گی اور اس طرح کی تحریف و تاویل سے کام لے کر جو قانون بنایا جائے گا۔ وہ کسی طرح بھی اسلامی نہیں کہلا سکتا جب اس کی شکل و صورت ہی بدل گئی تو اس کا تعلق خواہ مخواہ قرآن اور اسلام سے ملا لینا کوئی فائدہ بخش بات نہیں ہے۔

اب عبادات کو لیجیے۔ بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کا لحاظ کیجیے۔ زندگی کے بہتے ہوئے دھارے کی تو ہیں سے بچیے۔ ترقی اور سائنس کا منہ نہ چڑائیے۔ مہذب دنیا کا ساتھ دیجیے۔ زندہ رہنے کے لیے عبادات کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ضروری اور بہت سے اہم کام لازمی ہیں ان کا حق بھی ادا کیجیے تو ان کی صورت مسخ ہو کر کیا سے کیا رہ جائے گی، مثلاً:

۱۔ کلمہ

۲۔ نماز

۴۔ روزہ

۴۔ حج

۵۔ زکوٰۃ

۱۔ کلمہ طیبہ کے دو رکن کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ۔ بھائیو! اس کے دو جزو ہیں۔ پہلے میں اللہ کی توحید کا اقرار ہے، دوسرے میں نبی کریمؐ کی رسالت کا اعلان ہے۔ اب انسان جہالت کے زمانے سے نکل کر روشنی کے دور میں آگئے ہیں۔ جب ایک بار ایک سمجھ دار آدمی نے اس کلمہ کو پڑھ لیا تو اس کے بار بار دہرانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بس ایک بات معلوم ہو گئی اور ہم نے تسلیم بھی کر لی اب اس کا اعادہ کرا کر کے ہمارا دماغ خراب کرنا چاہتے ہو، جدید نفسیات کی رُو سے بس اتنا کافی ہے کہ آدمی ایک دفعہ حتمی طور پر ایک بات کو تسلیم کر کے اس بات کو لاشعور کے حوالے کر دے"۔ چلو کلمہ سے تو چھٹی ہو گئی۔

۲۔ نماز، "نماز کے اوقات کا تعین عرب کے حالات کے مطابق تھا۔ اب حالات بدل گئے۔ ضبط اوقات کے لیے نئے تقاضے اور نئی ضروریات کی رُو سے ایک صنعتی ملک کے لیے پنج وقتہ نماز کے لیے وقت نکالنا قومی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ڈالنا ہے

اسلام قوم کو آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ ترقی کا سبق دیتا ہے۔ تم تنزل کی باتیں کرتے ہو۔ ہم صرف ایک دن میں ایک وقت کے لیے ایسا کر سکتے ہیں یعنی جمعہ کے دن۔ آخر قرآن نے تصریح کے ساتھ جمعہ کی اذان سن کر نماز کا حکم دیا ہے اور پھر اس حکم کے ساتھ فضل اللہ کی تلاش بھی تاکیداً لگا دی گئی ہے، موجودہ حالات میں فضل کی تلاش زیادہ اہم ہے اور نماز کے لیے وقت نکالنا اسراف ہے اور اسراف سے اسلام نے روکا ہے" چلیے نماز سے بھی نجات مل گئی۔

جدید ترقی پسند مجتہدین کا گروہ جنھوں نے بجٹ ریوں کی مدد سے اور بلیک مارکیٹ کے فضل سے مجلسِ قانون ساز کی رکنیت حاصل کر لی ہوگی۔ وہ نماز کے لیے ایک ایسی کتاب الدعا Book of Modern prayer تصنیف فرمائیں گے جس کے چند اوراق کسی وقت بھی بیٹھے بٹھائے، سفر ہو یا حضر، پڑھ لیے جا سکیں اور یوں یہ فریضہ بھی ادا ہو جائے۔

علاوہ ازیں دوسرے فرائض کا بھی یہی حشر ہو سکتا ہے۔

قارئین کرام۔ گذشتہ بحث کے مطالعہ کے بعد یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ گذشتہ اوراق میں فرائض کی صحیح صورت کے قائم نہ رہنے کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ محض فرضی ہے، ایسا ہونا کیسے ممکن ہے؟

مسلمانوں کے ہاں جو فرائض توارث کے طور پر ادا ہو رہے ہیں، ان میں تبدیلی کیسے ہو سکتی ہے؟ حدیث کے منکرین تو فروعی معاملات میں دخل اندازی کے قائل ہیں وہ اساسی اور بنیادی باتوں میں دخل کب دیتے ہیں؟

ہم اس سوال کے جواب کے لیے منکرین حدیث کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے اور ان کی ان نگارشات کا حوالہ دیں گے جو دین کی اساسی باتوں سے متعلق ہیں تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے منہ موڑا جاتا ہے تو قرآن سے ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی۔ (تفصیل 'انکار حدیث کے چار نقیب' میں ملاحظہ ہو)

امرتسر کا ایک مشہور ہفتہ وار اخبار لکھتا ہے:

(انکار حدیث کے ابتدائی علم برداروں کی نیت آئندہ حوالوں سے بے نقاب ہو جاتی ہے)

۱۔ حدیث پر حملہ اور اس کی مدافعت[1]

مسلمانوں کے کل فرقے قرآنِ مجید کے علاوہ حدیث شریف کو حجت شرعی مانتے ہیں، سب سے بڑا اختلاف شیعہ سنی کا ہے،

---

[1] ۲۵ اگست ۱۹۲۲ء یوم جمعۃ المبارک

اس سے کم اور بہت کم مقلدین اور اہل حدیث کا ہے۔ مگر حدیث کی تسلیم میں یہ سب متفق ہیں باوجود سب کی تسلیم کے جماعت اہلحدیث خصوصیت سے ذمہ دار ہے، کیونکہ ان کا دعویٰ ہے:

ہوتے ہوئے مصطفیٰ کی گفتار
مت دیکھ کسی کا قول و کردار

اس لیے دشمن (منکر حدیث) کے حملے کو رد کرنے میں سب فرقے شریک ہوں گے۔ لیکن اہل حدیث اپنی ذمہ داری کی وجہ سے ان سب سے پیش پیش ہونے چاہئیں۔ یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ جماعت اہل حدیث اپنا فرض محسوس کرے۔

ہندو پاکستان میں سب سے پہلے سر سیّد احمد خاں نے حدیث کی حجیّت شرعیہ ہونے سے انکار کیا مگر احکام حدیثیہ (ہیئت نماز وغیرہ) کو تواتر کی صورت میں تسلیم رکھا۔ ان کے بعد پنجاب میں مولوی عبداللہ چکڑالوی نے اس کو کھلم کھلا موضوع بحث کا مقرر کر دیا جس کے دفعیہ کے لیے علماء حدیث متوجہ ہوئے چنانچہ مولانا ابراہیم سیالکوٹیؒ نے لاہور میں چکڑالوی صاحب سے بالمشافہ اتباع رسول پر بحث کی اور اس خاکسار نے بھی زبانی گفتگو کے علاوہ متعدد تحریرات بھی شائع کیں۔

آج کل ایک کتاب "شریعۃ الحق" پٹنہ سے شائع ہوئی ہے اور

دوسری "ہفوات المسلمین" حیدر آباد سے نکلی ہے۔ مصر میں بھی ایک جماعت اس خیال کی پیدا ہوگئی۔ امرتسر خاص میں ایک صاحب اِس خیال کے ہیں جو حدیث نبوی کو حجت شرعیہ نہیں مانتے اور اپنے گروہ نواح میں اس کی اشاعت کرتے ہیں بوجہ معاصرت اور بوجہ شہریت، اسباب کچھ ایسے پیدا ہو گئے کہ ان امرتسری صاحب کے ساتھ شریفانہ طریق سے تبادلۂ خیالات یا مناظرانہ رنگ میں کچھ پرچہ نویسی ہونی قرار پائی۔

میرا اور میرے احباب کا تقاضا یہی تھا کہ ایک جگہ بیٹھ کر بالمشافہ پرچہ نویسی ہو۔ مگر فریق ثانی نے ایسا کرنے میں اپنے آپ کو معذور بتایا چونکہ صحیح معنی میں حق شہریت ادا کرنا مقصود تھا۔ لہٰذا تسلیم کیا گیا کہ ہر کوئی اپنے اپنے مکان سے جب کبھی ہو سکے پرچہ فریق ثانی کو بھیجدیا کرے چنانچہ آج (۱۶ر اگست) تک ایک پرچہ آیا اور ایک گیا۔

جتنے آلات علمی سے حدیث پر حملہ ہو سکتا ہے۔ اس بحث میں وہ سارے آلات استعمال ہوں گے۔ اس لیے ناظرین تک اس حملے کی اطلاع کرنا میرا اُسی طرح فرض ہے جس طرح سرحدی افسر کا فرض ہے کہ دشمن کی ہر طرح کی تیاری کی اطلاع مرکزی حکومت کو کرتا رہے، تاکہ حکومت اس حملہ کے دفعہ کرنے پر تیار ہو سکے۔

اس کے بعد امرتسری صاحب (منکر حدیث) کا پرچہ اوّل درج کیا جاتا

ہے جس کا اوپر وعدہ کیا گیا تھا:

پرچہ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

مخدوم و مکرم بندہ جناب مولوی ثنا اللہ صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اندریں ایام آپ کی بار بار تحریک کے بعد کمترین نے تحریری بحث کے لیے رضامندی ظاہر کی جسے آنجناب نے ازراہِ نوازش منظور فرمالیا اب کمترین حسب الحکم آنجناب کے پہلا پرچہ ارسال خدمت کرتا ہے۔

و حق منشاءِ الٰہی کا نام ہے کسی مخلوق کا منشاء مطابقت مخوائے ربّی کی ضروری شرط کے بغیر اپنے آپ میں ہرگز ہرگز حق نہیں ہو سکتا حق کی دریافت کے دو طریقے ہیں۔ ایک وحی الٰہی۔ دوسرے عقلی ذرائع ان دونوں میں تین بڑے بڑے فرق ہیں۔

اوّل: وحی الٰہی صرف تصرفِ الٰہی سے ہوتی ہے اس میں کسی انسان کی عقلی و اختیاری کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا اس لیے وحی کی اطاعت حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے عقلی ذرائع سے بھی اگرچہ الٰہی منشاء کی ہی پیروی مقصود ہوتی ہے مگر چونکہ ان میں بشری عقل و اختیار کا

دخل ہوتا ہے اس لیے وہ ان دانائوں کی بھی اطاعت ہوتی ہے جن کی سعی و اجتہاد سے وہ علوم دریافت ہوئے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تمام اطاعت دراصل خدا تعالیٰ کے لیے ہی ہے۔ مگر وحی کی اطاعت خاص خدا کی اطاعت ہے اور جس اطاعت میں بشری عقل و اختیار کا دخل ہوتا ہے، صرف وہی اطاعت ٹھیک طور پر بشری اطاعت کہلا سکتی ہے۔

دوم: عقلی ذرائع کے ساتھ ہم خدا کے کاموں سے قیاس کر کے اس کا منشاء دریافت کرتے ہیں لیکن وحی کے ذریعہ سے خود خدا اپنا منشا ہم کو آپ ہی بتلا دیتا ہے۔ وحی کا حکم یقینی ہوتا ہے، لیکن عقلی باتوں میں غلطیاں بھی ضرور ہوتی ہیں پس خدا تعالیٰ کی خاص اطاعت صرف وحی کی اطاعت ہے۔

سوم: وحی کے ذریعہ سے جو علوم ملتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے صحیح ہوتے ہیں لیکن بشری عقل چونکہ محدود ہے اس لیے اس کے معلومات ہمیش در ہمیش بدلتے رہتے ہیں اور بحیثیت مجموعی بہتری کی طرف ترقی کرتے جاتے ہیں۔ عقلی فیصلے مختلف اوقات میں مختلف بھی ہو سکتے ہیں، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی بے تغیر اطاعت صرف وحی کی اطاعت ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طاعت اور مخلوق کی اطاعت ہرگز ہرگز ایک ہی طرح کی نہیں ہوسکتیں۔ خدا تعالیٰ کی اطاعت وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے کے لائق ہے اور مخلوق کی اطاعت وہ ہے، جو مخلوق کے لائق ہے۔ رسول بھی مخلوق ہی ہوتے ہیں پس اللہ اور رسولوں کی اطاعت میں بھی وہی فرق ہونا لازم ہے جو خالق و مخلوق کی اطاعت میں ہونا ضروری ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے غنی کرنے اور رسول کے غنی کرنے میں، اور اللہ کے شکر اور ماں باپ کے شکر میں، اور اللہ کے تقویٰ اور ارحام کے تقویٰ میں، اور اللہ کی ولایت اور رسول کی ولایت میں، اور اللہ کی مدد اور مومنوں کی مدد میں فرق ہے۔ ہُو بہُو وہی فرق اللہ کی اطاعت اور رسولؐ کی اطاعت میں ہے۔

(۲) قرآن مجید رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کو دوسرے بشروں کی مثل ہی بیان فرماتا ہے۔ پس آپ ضرور بشری عقل و اختیار رکھتے تھے۔ اور آپ کی بھی بشری عقل و اختیار والی باتیں تھیں جس طرح ہم وحی الٰہی کے محکوم ہیں، آپ بھی تھے جس طرح ہم اپنے عقلی و اختیاری کاموں میں جوابدہ ہیں، آپ بھی تھے۔ اِنَّہٗ لَذِکْرٌ لَّکَ وَلِقَوْمِکَ وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ کے فرمان سے آپ باہر نہیں تھے۔ پس آپ کے عقلی و اختیاری کام جو ابھی زیرِ حساب اور ماتحتِ سوال تھے وہ پہلے سے ہی وحی الٰہی

کیسے قرار پا سکتے ہیں۔ آپ کو مشوروں سے پختگی حاصل کرنے کا حکم تھا کہ کسی کام کے کل کرنے کا وعدہ بغیر انشاء اللہ کہنے کے نہ کریں۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کل کیا ہو جاتا ہے۔ آپ کو شیطانی نزغ کے وقت اعوذ باللہ کی دعا کرنے کا حکم ہے۔ آپ شیطانی ہمزات سے پناہ بھی مانگا کرتے تھے۔ آپ کو یہ بھی حکم تھا کہ اپنے گناہ کی بخشش مانگ!
حاصل یہ ہے کہ بالیقین آپ کی ایسی باتیں بھی تھیں جو وحی کے بغیر تھیں اور آپ عقل واجتہاد وشوریٰ سے ضرور ہی کام لیا کرتے تھے۔

(۳) لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی عقلی ذرائع والی اطاعت دین میں ضروری نہیں، بلکہ دینی معاملات کا انحصار بہت کچھ عقلی ذرائع پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان عالی شان " وامرھم شوریٰ بینھم " کے مطابق مومنوں کو اپنی ضروریات پوری کرنی چاہئیں۔ خود رسول خدا کو بھی مشورہ کرنے کا حکم تھا پس مشورہ کی مخالفت اس کے پکے ہونے کے بعد کرنا خلاف منشاء الٰہی یعنی گناہ ہے۔ اور اس کی متابعت ثواب اور نیکی ہے۔

محرم اگر کسی جانور کو مار ڈالے تو اس کا کفارہ دو عدل والے منصفوں کے فیصلے سے مقرر ہوگا جس کا ماننا دینی فرض ہوگا۔ یہی حال "حَکَماً مِنْ اَھْلِہٖ وَحَکَماً مِنْ اَھْلِھَا" کا بھی ہے۔ ادنیٰ عدالتوں کے

فیصلوں کی اپیل اعلیٰ عدالت میں ہو سکتی ہے۔ مگر اعلیٰ عدالت کے آخری فیصلہ کو اگر نہ مانا جائے تو فرمائیں کہ کیا کیا جائے، اگرچہ اعتقاداً ان کو غلط بھی سمجھا جائے مگر عملی تسلیم کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہو سکتا یہی حال تمام دیگر عقلی ذرائع کا بھی ہے۔ اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ عقلی ذرائع والی اطاعت بھی دین میں ازبس ضروری ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ وحی کی ضرورتوں کے مطابق جس قدر قطعی واجب الاتباع وحی درکار تھی۔ وہ کامل و اکمل طور پر قرآن مجید میں جمع کر دی گئی ہے۔ باقی ضروریات عقلی ذرائع پر چھوڑ دی گئی ہیں، تاکہ عقلی ذرائع اور صحیفۂ فطرت فضول اور نکمے نہ ہو جائیں۔ نہیں نہیں بلکہ ہم وحی کے ماتحت چل کر عقلی ذرائع سے ان لوگوں کی نسبت بہت زیادہ ترقیات کر سکتے ہیں جو محض عقل پر چلتے ہیں۔ پھر جو باتیں قرآن مجید نے عقلی ذرائع پر چھوڑ دی ہیں۔ ان میں رسولِ خدا بھی اپنی بشری عقل سے بالضرور کام لیتے تھے

پس آپ کی معقول باتوں سے فائدہ نہ اٹھانا ظلم صریح ہے۔ جب قرآن مجید احسن اور اہدیٰ بات کی پیروی کی تاکید فرماتا ہے تو کیا اپنے نبی کی ہی عقل سے مستفید اور مستفیض نہ ہونا صریح کفران نہیں ہے؟

حدیث بحیثیت معقول و احسن و اہدیٰ ہونے کے ہماری بھی ہے، نہ بحیثیت وحی کے۔

(۴) حاصل یہ ہے کہ ہمارا بے غلط اور بے تغیر اصول صرف وحی الٰہی ہی ہو سکتا ہے اور بس۔ اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ کیا اس وحی الٰہی کی تلاش کے لیے ہمیں در بدر مارے مارے پڑے پھرتے رہنا چاہیے؟ اور کیا کہیں توراۃ کو، اور کہیں انجیل کو، اور کہیں زبور کو، اور کہیں ملت و صحف ابراہیمؑ کو اور کہیں دوسرے انبیاء کی کتب کو اور کہیں ان انبیاء کی حدیثوں، اور کہیں بخاری کو، اور کہیں مسلم کو، اور ابوداؤد کو، اور کہیں نسائی کو، اور کہیں ابن ماجہ کو، اور کہیں ترمذی کو، اور کہیں موطا امام مالک کو، اور کہیں دوسرے اماموں کی مسندوں کو، اور کہیں اسماء الرجال کی کتابوں کو ڈھونڈتے پھرنا چاہیے؟ اور پھر باوجود اس کے بھی تمام الٰہی وحیوں کے مل جانے کا کبھی بھی پورا یقین حاصل نہ ہو، یا کیا یہ مناسب ہے کہ خدا تعالیٰ خود ہی رحم فرما کر ضروری وحیوں کا ایک ہی دستور العمل تیار کر کے ہمیں دے دے، جو اکیلا ہی ہمارے لیے کافی ہو اور وحیوں کی تلاش کی مالا یطاق تکلیف سے ہم کو نجات ہی دے دے۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید کی صورت میں خدا تعالیٰ نے یہ رحمت پورے طور پر ہم پر نازل فرما دی ہے۔ یہ بات اپنا آپ ہی ثبوت ہے۔ مگر مزید تسلی کے لیے ہم چند ایک اور دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔

(۵) قرآن مجید کی صورت ہی ایسی ہے جو صاف ظاہر کرتی ہے کہ

یہ کتاب کریم تمام انبیاء اور حکماء کی کتابوں کا عطر مجموعہ ہے۔ قرآن کریم تمام الٰہی کتابوں کی تصدیق فرماتا، اور پہلے لوگوں کی سنتوں کی ہدایت کرتا ہے، اور اُن کی پیروی کی تاکید فرماتا ہے۔ قرآن مجید یہ تصدیق ان کتابوں اور سنتوں کو اپنے میں لے کر تا ہے۔ اُن کا مستقل وجود قائم نہیں رہنے دیتا۔ ہُو بہُو اسی طرح قرآن مجید رسول اللہ کی لائف کے تمام ضروری حالات اور واقعات اور افعال واقوال کو اپنے میں شامل کر لیتا ہے جنگِ بدر واُحد واحزاب وحشر، وحنین وغیرہ کو ان کے واقع ہونے کے بعد بھی قرآن میں لانا ضروری سمجھا گیا۔ حدیث میں ہی رہنے دینا کافی نہ قرار دیا گیا۔ اسی طرح نکاح زینت، مقدمہ سورہ نساء اور منافقین کے بارے میں صحابہ کی دو پارٹیاں بننے کا ذکر بھی بعد از وقوع قرآن میں لانا ہی ضروری قرار پایا۔ تقسیم میراث، نکاح وطلاق۔ حرام وحلال عورات، حرام وحلال مطعومات، غسل ووضو، اور دیگر روزمرہ کی ضروریات کا (جو بالیقین پہلے بھی کسی نہ کسی رنگ میں عمل میں آتی تھیں) بیان قرآن میں داخل کرنا لازم سمجھا گیا۔ رسولِ خدا کے گھر بار کے حالات تک بھی قرآن میں لائے گئے۔ یہ سب کس لیے کیا گیا؟ کیا حدیثوں کا استقلال قائم رکھنے کو؟ اگر حدیثیں حفاظتِ الٰہی میں رکھنے کے قابل مستقل اصول سمجھی جائیں، تو یہ باتیں حدیثوں میں رہ کر بھی ویسی

ہی قابلِ سند ہو سکتی تھیں۔ ان کو قرآن میں لانے کی کوئی مزید ضرورت نہ تھی۔

(۶) اگر حدیثیں بطور وحی الٰہی کے کفار کے آگے پیش کر دی جاتی تھیں تو کیوں اُنھوں نے کبھی قرآن مجید کی مانند حدیثوں کے وحی ہونے کے متعلق بھی جھگڑے اور اعتراض نہیں کیے؟ کفار غیر قرآن کو تو خود مانگتے تھے وہ قرآن کے ہی بدلنے پر زور دیا کرتے تھے۔ منافق بھی سورتوں کے ہی نازل ہونے سے ڈرتے تھے۔ حالانکہ حدیثیں ہر وقت سامنے ہوا کرتی تھیں۔ مومن بھی سورتوں کے اترنے کا خیال کیا کرتے تھے، ایک دفعہ کچھ عرصہ کے لیے قرآن مجید کی وحی رُک گئی لوگوں نے قرآن کے رُکنے کو رسولِ خُدا کے متروک و مبغوض الٰہی ہونے کے برابر سمجھا، حالانکہ حدیثوں کا وقوع اس وقت بھی ہو رہا تھا۔ وُہ وقوع اُنھیں منظورِ الٰہی ٹھہرانے کو کافی نہ ہوا۔ پھر قرآن مجید تکلیف دِہ باتوں کے متعلق سوال کرنے سے روکتا ہے اور خوف دلاتا ہے کہ اگر قرآن کے نازل ہوتے وقت ان کا سوال کرو گے تو ضرور تم کو جواب مِل جائے گا۔ اب اگر حدیثیں بھی وحی سے ملتی تھیں تو کیوں ان سوالات کے جواب کو قرآن کے نزول کے ساتھ ہی وابستہ کیا گیا۔

(۷) کفار اعتراض کرتے تھے کہ کیوں یہ قرآن ایک ہی دفعہ سارے

کا سارا نازل نہیں کیا جاتا۔ اس کے جواب میں کئی دلائل بیان فرمائے:

اوّل: یہ کہ اس سے مصائب کے اوقات میں رسولِ خدا کے دل کو قائم رکھنا مقصود ہے اور ظاہر ہے کہ اگر اکٹھی ایک ہی وقت میں تمام تسلّیاں دے دی جائیں، تو وہ ساری زندگی کے لیے کافی نہیں ہو سکتیں۔ یہ جواب ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی اور حدیثی ذریعہ آپ کے دل کو قرآن کی طرح قائم رکھنے والا موجود ہوتا۔

دوم: یہ کہ قرآن پر جو اعتراض و سوال ہوں اُن کے قرآن میں ہی جواب دیے جائیں۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ اگر قرآن جیسا کوئی اور ذریعہ جواب دینے کا موجود تھا۔

سوم: یہ کہ قرآن کی ضروری تفسیر بھی ساتھ ساتھ ہی ہوتی جائے۔ یہ جواب بھی صحیح نہیں ٹھہرتا۔ اگر قرآن جیسی وحی والی تفسیر کرنے کو کوئی اور ذریعہ رسولِ خدا کے پاس تھا۔

(۸) قرآن مجید کی تبلیغ رسولِ خدا پر ایسی فرض تھی کہ چلتی تلواریں بھی اسے نہیں روک سکتی تھیں لیکن حدیثیں صرف حیار یا دلجوئی کے خیال سے بھی روکی جا سکتی تھیں۔ رسولِ خدا کے گھر میں غریب لوگ کھانا کھانے آیا کرتے تھے، وہ پکنے سے پہلے آ بیٹھتے تھے، اور کھانے کے بعد

حدیثوں کے لالچ میں لگے رہتے تھے۔ اکثر لوگوں کی ایسی ہی عادت ہوتی ہے۔ رسولِ خدا کو ان کے اس فعل سے اذیت ہوتی تھی۔ اگر آپ انھیں اپنے حدیثی بیان سے منع کر دیتے تو یہ بالکل بجا ہوتا۔ مگر آپ حیا کے سبب ایسی سچی حدیث بھی بیان نہیں فرماتے تھے جب یہی بات قرآن مجید میں نازل ہو گئی تو اس وقت اسی بات کے بیان سے وہی حیا آپ کو ہرگز ہرگز نہ روک سکی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

(۹) قرآن مجید کے متعلق تحدّی فرمائی گئی کہ اس کی مثل ایک سورت بلکہ ایک حدیث ہی لے آؤ۔ یہ تحدّی صرف عبارت آرائی میں ہی نہیں بلکہ زیادہ تر ہدایت میں ہے۔ جو قرآن مجید کا مقصود اصلی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو فرماتا ہے کہ "تو کہہ دے کہ اگر سچے ہو تو تورات اور قرآن سے زیادہ ہدایت والی کوئی الٰہی کتاب لاؤ میں اس کی پیروی کروں گا"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حدیثیں اس وقت بھی قرآن کی مثل نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ بلکہ تورات کا درجہ بھی نہیں رکھتی تھیں۔

رسولِ خدا فرماتے ہیں کہ اگر یہ قرآن میں نے اپنے دل سے بنالیا ہے، تو تم بھی جو میرے جیسے بشر ہو۔ اس کی مانند بنالاؤ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن مجید کے سوائے رسولِ خدا کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جو دوسرے بشر حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کو اپنے ذمہ لیا ہے لیکن، حدیثوں کو راویوں کے سچ جھوٹ پر چھوڑ دیا ہے۔ اگر حدیثیں داخلِ قرآن ہوتیں تو مثلیت د حفاظتِ قرآن میں کبھی داخل ہونی لازم تھیں۔ رسولِ خدا سے ہمارے پاس کوئی چیز سوائے قرآن کے الٰہی حفاظت کے ساتھ نہیں پہنچی۔ اگر حدیثیں قرآن مجید کی طرح ہمیشہ کے لیے مقصود اور ضروری التبلیغ ہوتیں تو ضرور قرآن مجید کی طرح ہی پہنچائی جاتیں:

زیادہ سلام مع الاکرام ——

دستخط: کمترین احمد الدین بقلم خود۔ مورخہ ۸ راگست ۱۹۲۲ء

آج سے چالیس سال قبل کے ان اعتراضات کا مقابلہ طلوع اسلام کے ڈاکٹر عبد الودود صاحب کے اعتراضات سے کیجیے ان میں کتنی مطابقت ہے۔

جواب پرچہ اول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت مولوی احمد دین صاحب امرتسری۔

وعلیکم السلام

مجھے مختلف ذرائع سے اطلاع ملتی رہی ہے کہ آپ حدیث نبویؐ کے منکر ہیں چونکہ میں حدیثِ نبویؐ کو دینِ الٰہی سمجھتا ہوں، اس لیے میرا

فرض ہے کہ میں کسی مسلمان کی نسبت منکرِ حدیث ہونا سنوں تو حق خدمت ادا کردوں، اس لیے میں نے آپ کے احباب سے کہا تھا کہ باہمی تبادلہ خیالات ہو جائے۔ مگر اُنھوں نے تقریری تو کیا بالمشافہ تحریر کی منظوری بھی آپ کی جانب سے نہ دی تو آخر کار میاں مولا بخش صاحب کی وساطت سے طے پایا کہ اپنے اپنے مکان سے پرچہ آجایا کرے۔ یہ بھی اُنھوں ہی نے کہا تھا کہ پہلا پرچہ آپ کی جانب سے ہوگا چنانچہ آپ نے بھیجا جس کا میں جواب بھیجتا ہوں۔

آپ کے پرچہ پر مفصل بحث کرنے سے پہلے میں اپنا عقیدہ درباره حدیث لکھ دینا ضروری جانتا ہوں، کیونکہ بوساطت میاں مولا بخش صاحب موصوف یہ قرار پایا تھا کہ:

"بحث حجیّت حدیث پر ہوگی"

میں اور قائلین حدیث نبوی حدیث کی نسبت وہی اعتقاد رکھتے ہیں جو امام شافعیؒ نے اظہار کیا ہوا ہے:

كُلُّ مَا حَكَمَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَهُوَ مِمَّا فَهِمَهُ مِنَ الْقُرْاٰنِ (اتقان۔ سیوطی)

جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیے ہیں، قرآن سے ہی سمجھ کر دیے ہیں۔

جس کو حافظ ابن قیّم مرحوم نے زاد المعاد میں مفصل بیان کیا ہے۔ اس عقیدے کا ثبوت قرآن مجید سے ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کا بیان کرنا اپنے ذمہ لیا ہے، ارشاد ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝

ہمارے (اللہ کے) ذمہ ہے قرآن کا بیان کرنا۔

اِسی فرضِ الٰہی کو دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرمایا ہے:

اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ

اے نبی! قرآن ہم نے تم پر اس لیے اُتارا ہے تاکہ تو لوگوں کے سامنے بیان کر دے جو اُن کی طرف اُترا ہے تاکہ وہ فکر کریں۔

یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ قرآن کا بیان کرنا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض قرار دیا ہے اور سابقہ آیت نے اس بیان کو فرضِ الٰہی بیان فرمایا ہے۔ ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کا قرآن کو بیان کرنا کسی عالم یا مجتہد کے بیان کی مثل نہیں جیسا آپ نے فقرہ ۳ میں لکھا ہے، بلکہ یہ بیان، بیانِ الٰہی ہے۔

اُس کی مثال آج کل کی اِصطلاح میں یوں ملتی ہے کہ قانون سازی، لیجسلیٹو کونسل کا کام ہے۔ ہائیکورٹ کا کام قانون سازی نہیں، مگر

جس قانونی دفعہ پر ہائی کورٹ کسی صورت میں فیصلہ کر دے۔ تو تمام صوبہ کے لیے وہ فیصلہ مثل قانون کے نافذ ہوتا ہے اور اگر پریوی کونسل کے جج کسی جانب رائے قائم کر دیں تو سارے ممالک محروسہ کے لیے حجت ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ فیصلہ قانون نہیں بلکہ قانون کی تشریح اور حسبِ قانون فیصلہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو قرآن کے ساتھ نسبتِ خاص ہے۔ اس لیے حدیثِ نبوی کے احکام کو خدا تعالیٰ نے احکامِ الٰہیہ میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ط

اے نبی! آپ نے اُن لوگوں کو دیکھا جن کو کہا گیا کہ جنگ سے ہاتھ بند رکھو اور نماز پڑھتے رہو۔

اِس آیت میں جو کُفُّوْا کا حکم ہے۔ یہ قرآنی احکام میں نہیں ملتا۔ پھر اس کو حکم واجب الاتباع قرار دے کر الزام کیوں لگایا گیا۔ اس کا جواب یہی ہے کہ زبانِ نبوت کا ارشاد تھا جو حکم الٰہی کے برابر قرار دیا گیا۔ اللہ اعلم

دوسری مثال اس کی یہ آیت ہے:

مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا

جس قبلہ (بیت المقدس) پر تُو اے نبی تھا ہم نے اس کو اس لیے مقرر کیا

تھا کہ تابعین (حکم نبی ماننے والوں) کو غیر تابعین سے جدا کر دیں (بقرہ)

اس آیت میں جَعَلَ کا مفعول بہ "القبلۃ" کو بنایا ہے، اور جَعَلَ فعل الٰہی بتایا ہے۔ حالانکہ مجھ ناقص العلم کو قرآن مجید میں ایسا کوئی فقرہ نہیں ملتا جس میں یہ حکم ہو کہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھو جس سے اس حکایت کا حکمی عنہ مل سکے۔ آپ قرآن مجید میں ان احکام کی تلاش میں کامیاب ہو جائیں تو میں آپ کی اطلاع پہنچنے پر مشکور ہوں گا۔

اب میں ایک دو مثالیں قرآن اور حدیث کی بیان کرتا ہوں جن سے یہ نسبت متعین ہو سکے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۞ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۞ پہلی آیت کی نسبت حضورؐ نے فرمایا اس پر رکوع میں عمل کرو اور دوسری کی بابت فرمایا اس پر سجدے میں عمل کرو چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے مقام غور ہے کہ اس ارشاد نبوی سے کیا مفہوم ہوا پس یہی کہ اس حکم کے مختلف محلّوں میں سے ایک محل واجب العمل معین فرما دیا:

اسی طرح حرمت میں خنزیر کے ساتھ کتّے کو ملحق فرما دیا۔ ورنہ قرآن مجید میں کتّے کی حرمت کے لیے کوئی خاص حکم نہیں۔ شاید آپ تلاش میں کامیاب ہو جائیں۔

آپ کے فقرات عشرہ پر اجمالی نظر یہ ہے:

آپ نے لکھا ہے کہ "رسول ایک بشر ہے مثل ہماری مخلوق ہے۔ اور مخلوق اور خالق کی اطاعت میں فرق ہے"۔ آپ نے اس میں حیثیت کا فرق نہیں کیا۔ رسول بحیثیت بشریت ہماری طرح ایک مخلوق ہے جس کی اطاعت نہ فرض ہے، نہ واجب۔ مگر بوصف رسالت اور بحیثیت نبوۃ اس کی شان یہ ہے کہ اس کی اطاعت بعینہٖ خدا کی اطاعت ہے۔ غور سے پڑھیے

مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ

جو رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ خدا کی اطاعت کرتا ہے (الآیہ)۔

میری پیش کردہ مثال مذکورہ یہاں بھی صادق آسکتی ہے۔ ہائی کورٹ کا جج بحیثیت ایک فرد رعیت ہونے کے کوئی چیز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قبل تقرر اس کا فیصلہ کچھ نہیں۔ بعد پلشن بھی ہیچ ہے۔ مگر بحیثیت وصفِ حکومت جو کچھ ہے وہ عیاں ہے۔

اب میں تفصیل وار آپ کے فقرات عشرہ پر نظر کرتا ہوں:

فقرہ نمبر ۱:

صحیح ہے، بجز اتنے حصّے کے جو رسول کے متعلق میں ابھی عرض کر چکا ہوں۔

فقرہ نمبر ۲:

جو باتیں رسولؐ کے اپنے اجتہاد سے غلط ہوتی تھیں اُن پر تنبیہ الٰہی

وارد ہو جاتی تھی۔ ملاحظہ ہو:

عَفَی اللّٰہُ عَنْکَ لِمَ اَذِنْتَ لَہُمْ ؛ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ ط وغیرہ

جن پر تنبیہ نہیں ہوتی تھی وُہ مسلّمہ رہتی تھیں تاکہ بحکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ اُمت کے لیے اُسوہ حسنہ بن سکیں:

فقرہ نمبر ۳:

آپ نے لکھا ہے " ہمارا دعویٰ ہے کہ وحی کی ضرورتوں کے مطابق جتنی وحی درکار تھی قرآن مجید میں جمع کر دی گئی ہے"

بتشریح بالا ہیر ابھی اس پر صاد ہے۔

فقرہ نمبر ۴:

بیان رسول جو بقول آپ کے بھی اہدیٰ اور احسن ہے (ملاحظہ ہو اخیر فقرہ نمبر ۳) اس کی تلاش کے لیے کتنی بھی تکلیف ہو برداشت کرنی عین حکم الٰہی کے ماتحت کارِ ثواب ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ

بس ہمارا یہی ایمان ہے کہ بتشریح بالا قرآن مجید کے ذریعے سے خدا نے یہ رحمت پوری کر دی۔

فقرہ نمبر ۵ : (اس کے جواب میں)

ہماری پیش کردہ مثال کافی ہے کہ قانون بذاتہ مستقل ہے اور ہائی کورٹ اور پریوی کونسل کے فیصلے مستقل بالذات نہیں۔ بلکہ، قانون پر متفرع ہیں مگر پابندی میں برابر۔

جنگِ بدر ہو یا اُحد وغیرہ کا قرآن مجید میں مذکور ہونا اور اس کی تشریح کا حدیثوں میں ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

فقرہ نمبر ۶ :

ہماری پیش کردہ مثال اس کا جواب کافی ہے۔

لطیفہ : قرآن مجید رُکنے پر مبغوض ہونا قرآن سے ثابت نہیں حدیث سے استدلال کرنا گویا حدیث کو قابلِ استدلال تسلیم کر لینا ہے

فافہم :

قرآن کے سوا اور کوئی ذریعہ تھا مگر بحالتِ عمومات قرآنی، جس کی مثال ہم دے چکے ہیں۔

فقرہ نمبر ۷ :

جواب ایضاً

فقرہ نمبر ۸ :

حیاء کے وقت پردہ کا حکم نہ تھا نہ قرآنی نہ حدیثی۔ بلکہ ضرورت ذاتی تھی جس میں حیا مانع ہو سکتی ہے۔ جب حکم آیا تو حیا مانع نہ ہوئی۔

فقرہ نمبر ۹ :

قرآن کی مثل بلاغت اور نظام عبارت (بقول سرسید مرحوم ہدایت بھی سہی) اور اخبار غیبیہ میں تھی۔ حدیثوں میں یہ مجموعہ اوصاف نہیں لہٰذا تحدی بھی نہیں۔ آپ کا یہ کہنا کہ "رسولِ خدا کے پاس کوئی اور چیز نہ تھی جو اور بشر میں نہ تھی"۔ قرآن مجید کے صریح خلاف ہے۔ غور سے سنیے!

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ
يُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

رسول کے حکم سے سرتابی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے۔ اس سے کہ ان کو کوئی مصیبت پہنچ جائے یا سخت عذاب سر دست۔

فقرہ نمبر ۱۰ :

راویوں کا سلسلہ متاخر ہے۔ ہماری گفتگو پہلے مرحلے میں ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ اقوال نبویہ کو خواہ ہم ان سے براہ راست سنیں کیا نسبت ہے۔ اگر وہی نسبت ہے جو ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔ اور قرآن مجید سے ثبوت دے آئے ہیں تو راویانِ کلام کی مشکل خود ہی حل ہو جائے گی۔

استفسار :

اور کسی سے گفتگو ہوتی تو نوعیت اور ہوتی۔ مگر چونکہ یہ سلسلہ محض دوستانہ

ہے اس لیے بشکل استفسار عرض ہے کہ آپ بتائیں کہ آپ کا فقرات عشرہ ۔ الگ الگ مستقل دس دلیلیں ہیں یا سارے مل کر ایک دلیل ہے اور تعدد ان میں مثل تعدد اجزا کے ہے ؟ ہاں یہ بھی فرمائیں کہ اس موضوع میں آپ کا دعویٰ کیا ہے ۔ جس پر یہ ایک یا دس دلیلیں آپ نے پیش کی ہیں ۔ مہربانی فرما کر حسب قاعدہ اپنے دعویٰ پر سب سے پہلے اطلاع دیں ؛

منکرین حدیث کے اعتراضات کے جوابات چاہے کتنی وضاحت سے دیے جائیں اُن کا یہ مقررہ طریقہ ہے کہ وہ اعتراضات کو دہراتے جائیں گے اور آج تک دہرا رہے ہیں۔

۲
اہل قرآن اور حدیث

جناب مولانا!

السلام علیکم : میں نے مولوی حشمت علی اہل قرآن کو حدیث کی بابت لکھا تھا کہ تم لوگ منکر حدیث ہو۔ انھوں نے جو جواب دیا۔ وہ بغرض اشاعت ارسال ہے:

" السلام علی من اتبع الھدیٰ آپ کا عنایت نامہ مورخہ ندارد پہنچا ۔ آپ نے رسالہ اشاعت القرآن کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ کئی بار

دیکھنے میں آیا ہے۔ اس میں بجز اس امر کے کہ حدیثِ نبوی کوئی چیز نہیں بلکہ مفتریات کا بنڈل ہے اور کچھ نہ پایا "

جواباً عرض ہے کہ رسالہ مذکور میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ حدیث نبویؐ کوئی چیز نہیں، بلکہ یہ حدیث جو پیش کی جاتی ہے نبوی نہیں اور آپؐ (حضرتؐ) اس سے پاک ہیں۔ آپؐ (حضرتؐ) کے ذمہ ناحق لگائی گئی ہے جنابِ من! رسول سلام علیہ کی حدیث کا منکر تو ہمارے نزدیک بھی السلام سے خارج ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جس حدیث پر اعتراض ہے وہ رسول سلام علیہ نے فرمائی بھی ہے یا ناحق اُن کے ذمہ لگا دی گئی ہے اور کوئی ایسی حدیث نبوی ہو بھی سکتی ہے جو قرآنی مضمون کی مخالف ہو۔ مطابق آیہ انہ لقول رسولٍ کریم۔ مناسب تو یہ تھا کہ جس حدیث پر اعتراض ہے کہ قرآن شریف اس کی تصدیق نہیں کرتا اور وہ رسولِ پاک کے ذمہ ناحق لگا دی گئی ہے۔ اس کو قرآن شریف کے مطابق ہونے کے دلائل لکھے جاتے نہ کہ بلا دلیل حدیث نبوی کے منکر ہونے کا جرم لگایا جاتا ہے۔ نبوی کا لفظ آپ نے اپنی طرف سے ہمارے ذمہ لگا دیا ہے جو بعد از انصاف ہے۔ بلکہ ثبوت اس بات کا ہے کہ اسی طرح وہ خلاف مضمون قرآن احادیث رسول سلام علیہ کے ذمہ لگا دیے گئے ہیں جس طرح آپ نے حدیث نبوی کا انکار ہمارے

ذمہ لگا دیا ہے۔

(سیکرٹری انجمن اہل قرآن لاہور)

اہل حدیث

دھوکہ بازی یا اخفاء حق ہر طرح بُرا ہے۔ خصوصاً مذہب میں تو بہت ہی بُرا ہے۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی بانی فرقہ اہل قرآن میں یہ خوبی تھی کہ وہ صاف صاف اپنا مذہب بتاتے تھے اس لیے اُنھوں نے اپنی تصنیفات میں صاف صاف لکھا ہے کہ (معاذ اللہ) حدیثیں سب شیطانی خیالات ہیں" مگر مولوی حشمت علی صاحب جو آج کل اُن کے خلیفہ ہیں ذوالوجوہ بات کہتے ہیں۔ آپ نے اس خط میں حدیث نبوی کے انکار سے انکار کیا ہے۔ ایسا ہی رسالہ ۱۴ء میں لکھا ہے کہ:

"ہم حلفاً کئی مرتبہ اس امر کا اعلان کر چکے ہیں کہ جو شخص محمد رسول اللہ اور آپ کی حدیث اور اقوال اور آپ کے اصحاب کا مخالف ہے وہ ملحد اور کافر ہے"

کیسی صفائی سے اقرار حدیث ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"فقیر کی تحقیق میں ان (رسول اللہ اور صحابہ) کے اقوال اور حدیث

تو صرف قرآن کریم ہی ہے جو ہر طرح مفصل اور مکمل ہے"۔ ص ۳
پس فیصلہ ہوا کہ آپ جہاں حدیث نبوی کا اقرار کرتے ہیں اُس اقرار میں دراصل انکار مخفی ہوتا ہے کیونکہ آپ کی اصطلاح میں حدیث نبوی حدیثِ قرآن کا نام ہے، وگرنہ ہیچ۔ اور جملہ اہل اسلام کی اصطلاح میں حدیث نبوی سوائے قرآن مجید کے اس روایت کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بسلسلہ راویان کے پہنچے۔ نہیں معلوم سائل کے سوال (جو عام اہل اسلام کی اصطلاح پر مبنی ہے اس) کا جواب اپنی اصطلاح خاص سے دینا کہاں تک جائز ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بالکل اس مکالمہ کے مشابہ ہے جو ایک عاشق نے اپنے معشوق کو اپنی اصطلاح میں پری کہہ کر مخاطب کیا۔ تو اس نے عام اصطلاح کے مطابق جواب دیا جو یہ ہے:

؎ میں نے کہا سایہ کرو مجھ پہ اے پری
بولا کہ اس کے سایہ سے پرہیز چاہیے

ایمانداری و دیانتداری کا مقتضا یہ ہے کہ سائل کا مافی الضمیر سمجھ کر صحیح صحیح جواب دیا جائے نہ کہ سوال کو اُلجھن میں ڈال کر غلط جواب سے خاموش کرنے کی کوشش کی جائے۔ امید ہے سائل اور مجیب آئندہ اس اصول سے باخبر رہیں گے" اہلحدیث ۲ مارچ ۲۳ء

مروجہ اصطلاحوں کو خواہ مخواہ بدل کر نئے معنی پہنانا
کوئی حق پسندی نہیں

۳

اصلاح نماز

تو کار زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

مسلمانوں کے دماغ آج کل عجیب بلندی کی طرف جا رہے ہیں احکام شرعیہ کی توقیر اور تصدیق تو یہ تھی کہ :

اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا

دل اور زبان سے بے چون وچرا تصدیق اور تعمیل ہوتی۔

آج کل کے زمانہ کو ترقی کا زمانہ کہا جاتا ہے جو حقیقتاً باصطلاح صلحا تنزل کا وقت ہے۔[1] اس زمانہ میں کثرت سے مسلمان ہیں جو نماز پڑھتے ہی نہیں (مگر فرض جانتے ہیں) ایک گروہ پیدا ہوا ہے جو نماز کو بیکاری کا شغل جانتا ہے اور خود کو اتنا عدیم الفرصت جانتا ہے کہ بحکم اصول (ٹائم از منی) نماز میں وقت لگانا قیمتی چیز (وقت)

---

[1] یکم فروری ۱۹۲۹ء یوم جمعۃ المبارک اہلحدیث

کا بے کار ضائع کرتا ہے۔

تیسرا گروہ بھی ہے جو نماز کو فرض جانتا ہے مگر بیماروں کی تنگی اور صفائی ان کو نماز سے مانع ہوتے ہیں۔

اِن سب گروہوں کے علاوہ امرت سر میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہوا ہے جو مروجہ نماز کی تحسین کرتا ہے مگر تھوڑی سی اصلاح کا خواہشمند ہے چنانچہ اس گروہ کے سرگروہ کے الفاظ یہ ہیں:

"ہماری مروجہ نماز میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ یہ تمام نمازوں کا خلاصہ ہے۔ مروجہ دعاؤں کے علاوہ ہم اس میں اور دعائیں بھی مانگ سکتے ہیں اور خدائے تعالیٰ کو اور بھی زیادہ یاد کر سکتے ہیں اور اس کی طرف دھیان لگا سکتے ہیں اور اگر اس میں تین اصلاحیں کر دی جائیں تو کسی صلح پسند خدا پرست کو ہمارے ساتھ مل کر نماز پڑھنے میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکے گا۔

اوّل: التحیات للہ میں السلام علیک ایہا النبی کی جگہ السلام علی النبی کہا جائے۔ یہ اصلاح نہایت ہی ضروری ہے۔ نماز میں کسی مخلوق کے ساتھ بات چیت کرنا صحیح نہیں اور پھر اس مخلوق کے ساتھ جو سامنے موجود نہ ہو

بلکہ دوسرے عالم میں پہنچی ہوئی ہو۔

دوم: اگرچہ التحیات پر صالحین پر سلام کہا گیا ہے۔ لیکن اگر درود شریف میں بھی رسولِ خدا اور آپ کی آل کے ساتھ دوسرے مذاہب کے صالحین اور مصطفےٰ لوگوں کو ملا لیا جائے تو اس سے ہماری صاف دلی اور رواداری کا ثبوت ملے گا۔ کوئی نقص نہیں پیدا ہو جائے گا۔ میں مانتا ہوں کہ آل ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ میں یہود و نصاریٰ کے تمام نیک بندوں پر درود و برکات کے نازل ہونے کا ضرور ذکر آجاتا ہے۔

سوم: جو لوگ عربی زبان کو نہیں سمجھتے۔ یا الفاظ کو طوطے کی طرح رٹ لینے کے سبب اُنھیں توجہ الی اللہ نہیں حاصل ہوتی۔ انھیں چاہیے کہ اپنی اپنی زبان میں ذکر الٰہی کریں اور دعائیں مانگیں"

("بلاغ" امرتسر یکم دسمبر ۱۹۲۸ء ص ۲۰۸/۲۰۹)

اہل حدیث

یہ اصلاح اگر غیر مسلموں کو نماز میں شریک کرنے کی غرض سے ہے تو

ہمارے خیال میں چند اصلاحات کی ابھی ضرورت ہے:

الف: کعبہ شریف کی طرف منہ کرنے کی ضرورت اُٹھادی جائے کیونکہ غیر مسلم اس کو ناپسند کرتے ہیں۔

ب: التحیات میں "عبدہ ورسولہ" بھی حذف کیا جائے کیونکہ غیر مسلم اس کو ناپسند کرتے ہیں۔

ج: سورہ فاتحہ میں ایاک نعبد و ایاک نستعین بھی حذف کیا جائے کیونکہ نیک دل بت پرست اور نیک طبیعت عیسیٰ پرست وغیرہ لوگ اس حصر کے قائل نہیں۔

د: نماز میں کوئی آیت ایسی نہ پڑھی جائے جس میں نبوت محمدیہ کا اقرار ہو جیسے اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتَابَ یا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَھُوَ الْحَقُّ

ہ: اللہ اکبر بھی نہ کہا جائے کیونکہ لاہوری اہلِ قرآن صالحین اکمال علمی سے اس کو شرک کہتے ہیں۔

و: درود میں آلِ محمد کا لفظ بھی حذف کیا جائے کیونکہ خارجی لوگ آلِ محمد کے منکر ہیں یا تاویل کرتے ہیں۔

ز: قرآن کی سورہ اخلاص (قل ھو اللہ احد) نماز میں نہ پڑھی جائے کیونکہ تثلیث کے قائل (صلیح جو عیسائی بھائی) اس

کے مخالف ہیں۔

ہماری ان تزمیمات معقولہ کے بعد جتنا حصہ نماز کا رہے گا اس پر مزید غور کرنا ابھی باقی ہے"

ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حدیث سے ہٹ کر وہیں کے ارکان کا کیا انجام ہوگا۔ اور منکرین حدیث کے پیش نظر اصلاح ہے یا تخریب دین۔

امرتسر کی اہل قرآن جماعت میں بہمواز مم[1]

امرتسر کی اہل قرآن (منکر حدیث) پارٹی کا آرگن رسالہ "بلاغ" ہے جس کا دعوی ہے کہ ہیں صرف قرآن شریف کا مبلغ ہوں۔ قرآن شریف کی تبلیغ کرنا ہر انسان کے لیے سعادت ہے کیونکہ یہ ذکر مبین ہے ھدی للناس بلکہ ھدی للمتقین ہے۔ مگر قرآن مجید کو اپنی رائے[2] کے ماتحت کرنا قرآن کی تبلیغ نہیں بلکہ اپنی

[1] ۲۲ر فروری ۱۹۲۹ء یوم جمعۃ المبارک۔ اہلحدیث

[2] بلاغ والے لوگ قرآن شریف کو اپنی عقل سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

راستے کی تبلیغ اور قرآن کی توہین ہے۔

برہمو سماج یہ مذہب بنگال سے نکلا۔ ہندوؤں میں ایک صاحب راجہ رام موہن بنگالی ہوئے جو بہت بڑے قابل تھے۔ انھوں نے ہر مذہب کی کتابوں کو مطالعہ کیا ان سب مذاہب میں سے جو جو بات اُن کے خیال میں اچھی معلوم ہوئی اُس کو اُنھوں نے قبول کیا بت پرستی کو چھوڑ کر توحید اختیار کی۔ چھوت چھات ترک کر دی عبادت کا طریق انھوں نے یہ تجویز کیا کہ:

"انسان خدا کی طرف متوجہ ہو کر خدا کی صفات کاملہ اور اپنی صفاتِ ناقصہ کا تصور کر کے خدا سے بھلائی کی دعا مانگے۔ وغیرہ"

اتنا کرنے کے لیے اُن کے نزدیک کسی مقام کی یا کسی جہت کی ضرورت نہیں۔ یہی اُن کی عبادت ہے یہی اُن کی نماز۔ بنگال کے بڑے بڑے ہندو لیڈر مثل بابو سی۔ آر داس وغیرہ ذاتی طور پر سب برہمو ہیں

امرتسری اہل قرآن کی نسبت ہماری تحقیق ہے کہ یہ لوگ بھی آہستہ آہستہ برہمو سماج سے ملتے جا رہے ہیں۔ اس کا ثبوت پیش کرنا آج کے اس نوٹ میں مقصود ہے۔

مسلمانوں میں | ہیں گو کتنا ہی اختلاف ہے لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ نماز ایک خاص صورت اور ہیئت کے ساتھ قبلہ رُخ ہو کر ادا کرنی اسلامی فرائض میں سے ایک اہم فرض ہے۔ جس کے ارکان یہ ہیں:

قیام ۔ رکوع ۔ سجود ۔ توجہ الی القبلہ وغیرہ

نماز کے منافی ان ارکان میں کسی مسلم کو اختلاف نہیں، شیعہ سنی موحد، مقلد وغیرہ سب اس پر متفق ہیں مگر امرتسری اہل قرآن پارٹی نے اعلان کر دیا ہے کہ:

"نماز کی اصل حقیقت میں یہ چیزیں داخل نہیں بلکہ نماز صرف ذکر اور دعا ہے خواہ ان ارکان کے ساتھ ہو یا ان کے بغیر ہو"

یہ مضمون انھوں نے اپنے رسالہ بلاغ بابت جنوری ۱۹۲۹ء میں حسب عادت ایک طویل عبارت میں ادا کیا ہے جس کا خلاصہ انہی کے الفاظ میں یہ ہے۔

"حاصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک ہی وقت مثلاً صبح کے وقت فرمایا ہے کہ "فجر کے پڑھنے کو قائم کر۔ بلا شبہ فجر کا پڑھنا دلنشین ہوتا ہے"۔ اور ارشاد کیا کہ سورج نکلنے سے پہلے تسبیح د

تحمید کر۔ اور فرمایا کہ تو اپنے جی میں یا آہستہ بول کر ذکر الٰہی کر اور ان لوگوں کی تعریف کی جو صبح کے اوقات میں استغفار کرتے ہیں۔ اس تعریف میں کوئی اور چیز ساتھ نہیں ملائی۔ یہ بھی دکھلایا کہ نیک لوگ صبح کو دعائیں مانگتے ہیں پھر ڈنکے کی چوٹ پکار کر کہہ دیا کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر یا کسی اور نیک نام کے ساتھ ہر طرح اجازت ہے۔ کیونکہ سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں پھر کس نام اور کس تعریف کو اس کے لیے مخصوص بنا لینا چاہیے اور باقیوں کے ترک کا فتویٰ دے دینا چاہیے افسوس! افسوس!!" ص ۲۲

اس اقتباس میں بھی اسی طرف رُخ ہے کہ اصل نماز کی حقیقت محض ذکر اور دعا ہے۔ ارکان مخصوصہ اس میں داخل نہیں۔

اس کے بعد پھر لکھا ہے کہ:

"جب قرآن مجید نے پہلے تمام لوگوں کو اقیموا الصلوٰۃ فرمایا ہوگا تو اس کے معنی بھی مذکورہ بالا طور پر کرنے ہی لازم و واجب ہوں گے۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن حکیم رسول اور دوسرے لوگوں کو یا تو اپنی سکھائی ہوئی نماز کا حکم دے سکتا ہے یا دوسری کتابوں

کی سکھائی ہوئی یا اپنی سمجھ سے نکالی ہوئی نماز کی بابت ہی کہہ سکتا ہے کہ اسے قائم کرو"۔ ص ۲۳۴

اس سارے بیان سے نتیجہ بتایا ہے کہ :

"برادران! قرآن مجید کوئی ایسی مخصوص نماز ہرگز نہیں سکھاتا جس سے دوسروں کی نمازیں مطلقاً نماز نہ سمجھی جائیں۔ اور خدا پرست لوگ موقع پڑنے پر خدا کی یاد میں اکٹھے نہ ہو سکیں اگر قرآن مجید میں کوئی ایسی مخصوص نماز (مروجہ) ہوتی تو تمام اہلِ عرب کو تو نہ سہی اہل قرآن ہونے کے مدعیوں کو تو مشترکہ طور پر نظر آجاتی۔ اندریں صورت جو لوگ قرآنِ کریم سے ایسی مخصوص نمازوں کے نکالنے کی کوشش کریں گے بالضرور نئے نئے فرقوں میں تقسیم ہوتے جائیں گے" ص ۲۳۵

پس اس تقریر سے صاف ظاہر ہے کہ اس جماعت کے نزدیک نماز کی اصل حقیقت صرف اتنی ہے جو برہموؤں کے نزدیک ہے۔ ہاں مروجہ نماز کو بھی یہ لوگ نماز کہتے ہیں اس لیے کہ اس میں ذکر الٰہی ہے۔ مگر ارکان کو داخل ماہیت نہیں جانتے چنانچہ اُن کے اپنے الفاظ یہ ہیں :

"ہم اس (مروجہ) نماز کو بہت عمدہ اور معقول سمجھتے ہیں اور،

بخوشی ادا کرتے ہیں لیکن دوسروں کی موحدانہ اور معقول نمازوں کی کبھی بے قدری نہیں کرتے اور کسی دردمند دل کے ذکر کو حقیر نہیں جانتے" ص ۲۳۱

اہل حدیث

بس اصل حقیقت نماز اُن کے نزدیک وہی ہوئی جو بریلویوں کے نزدیک ہے یعنی صرف ذکر اور دعا۔

ہم اس مضمون کی تردید کرنے کی ضرورت نہیں جانتے کیونکہ یہ ایک ایسا مضمون ہے جو مسلمانوں کی قومی اور مذہبی تواتر کے خلاف بلکہ قرآن مجید کی نصوص قطعیہ کے صریح مخالف ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں ارکان صلوٰۃ کے لیے صاف صاف ارشاد ہے:

قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ . اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ. لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

ان آیات میں قیام۔ رکوع اور سجود کا صاف لفظوں میں حکم ہے۔ اس سے ہٹ کر کیا چاہیے۔ مگر نہ ماننے والوں کے لیے تو کوئی حکم کیا ہی صاف سے صاف لفظوں میں ہو سکتا نہیں ہو سکتا چنانچہ:

مسئلہ قبلہ کی بابت، اس جماعت کی رائے خاص کر سننے کے قابل ہے کیونکہ یہ جماعت کعبہ کی طرف منہ کرنا ضروری نہیں جانتی۔ اس لیے رسالہ "بلاغ" بابت فروری ۱۹۲۹ء میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی۔ قرآن مجید میں صاف لفظوں میں ارشاد ہے:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ

قابل مضمون نگار (مولوی احمد الدین صاحب جو اس جماعت کے سرگروہ ہیں اور آج کل قرآن مجید کی تفسیر لکھ رہے ہیں، اُس تفسیر میں فرماتے ہیں۔

"شطر کے معنی ہیں جہت کے اور ان آیات میں جہت و قبلہ و وجہہ صلوٰۃ کے ہی ہیں چونکہ مسجد الحرام میں نماز ہر طرف پڑھی جاتی ہے۔ اس لیے مسجد الحرام کی جہت صلوٰۃ ہر طرف ہے اور مسجد الحرام کی جہت صلوٰۃ کی طرف منہ کرنے کے معنی ہر طرف منہ کرنے کے ہیں۔ یہ مسجد ھدی للعالمین ہے اور ہر جائی قبلہ کا سبق دیتی ہے۔ یہ مسجد سفر و حضر میں ہر جگہ خود ہی قبلہ نہیں بن سکتی جیسا

کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اس لیے ہر جگہ اس کی جہت صلوٰۃ کی طرف ہی منہ کرنا چاہیے جیسا کہ آگے ارشاد ہوتا ہے:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

کے ایسے معنی لینے غلط ہیں جن سے ایک مخصوص قبلہ کی خصوصیت کو مٹا کر دوسرے مخصوص قبلہ کی خصوصیت کو قائم کیا جائے"۔

اہل حدیث

"مطلب در بطن قائل" کی مثال دیکھنی ہو تو یہ ہے۔ ہاں جو کچھ ہم نے اس عبارت کا مطلب سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ:

"جس طرح کعبہ کے چوطرف نماز پڑھتے ہیں اسی طرح یہاں (ہندوستان میں) بھی ہم ہر طرف۔ مشرق۔ مغرب، اُتر دکن کو رُخ کر کے پڑھ سکتے ہیں کیونکہ بہ قول آپ کے مسجد الحرام کی جہت صلوٰۃ ہر طرف ہے"

کیا کوئی ذرہ بھر بھی عربی علم سے واقف اس تشریح کو تفسیر کہہ سکتا ہے یا تحریف کہنے پر مجبور ہے۔

اے جناب! "مسجد الحرام کی جہت صلوٰۃ ہر طرف ہے" اس
کا مطلب یہ ہے کہ مسجد الحرام کی چاروں طرف کھڑے ہو کر اس
کی جانب منہ کر کے نماز پڑھ سکتے ہیں نہ یہ کہ اس کی طرف پیٹھ
کر کے مغرب یا مشرق کو رُخ کر کے پڑھ سکتے ہیں۔ ہم بغرض
تفہیم ذیل میں مسجد الحرام کا نقشہ دیتے ہیں

چار نمازی ہیں۔
ان میں سے ایک الف کی جگہ، دوسرا ب کی، تیسرا ج
کی، چوتھا د کی جگہ کھڑا ہو کر مسجد الحرام کی طرف منہ کر کے نماز
پڑھ سکتا ہے۔ یہی اس کی شطر (جانب) ہیں۔ یہ نہیں کہ مسجد الحرام
کی دیواروں کے ساتھ پیٹھ لگا کر مشرق، مغرب کو منہ کر کے نماز پڑھے
تو جائز ہے۔

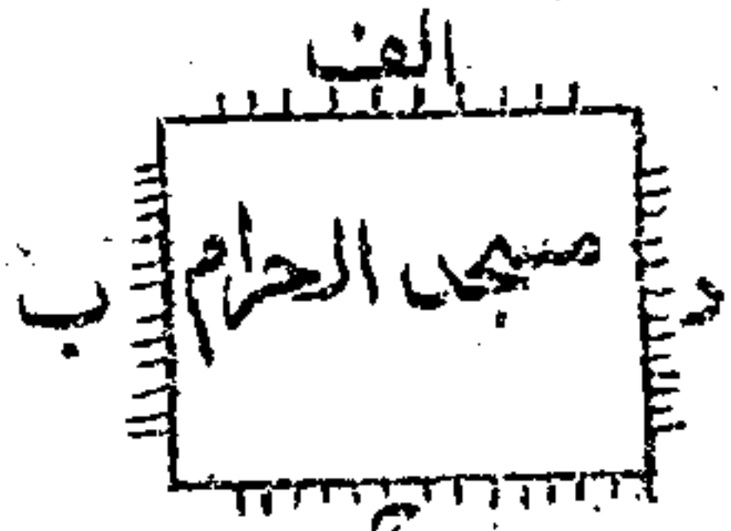

ہاں یہ بھی آپ نے خوب کہا اور ہم نہیں سمجھتے کہ آپ کو کہاں تک
یہ مفید ہے جو فرماتے ہیں کہ:

"فول وجھك شطر المسجد الحرام کے ٹھیک معنی

یہ ہیں کہ تو اپنے منہ کو مسجد الحرام کی طرف نہیں بلکہ مسجد الحرام کے شطر کی طرف پھیر" ص ۲۴۷

بہت خوب | پس اب مطلع صاف ہے شطر کے معنی جہت کے آپ کو تسلیم ہیں۔ ملاحظہ ہو عبارت منقولہ از ص ۲۴۷۔

اب ہم پوچھتے ہیں کہ ہندوستان خاص کر صوبہ پنجاب میں بیٹھے ہوئے نظر کریں کہ مسجد الحرام کدھر ہے؟ جواب ملتا ہے کہ گرمی سردی کے مغربین کے درمیان پس اس صورت میں مسجد الحرام کی جہت یا شطر مغربی طرف ہوئی جس کا نقشہ یہ ہے۔

(مشرق) پنجاب (مغرب) | مسجد الحرام |

اب اہل پنجاب کو حکم ہوتا ہے کہ نماز میں مسجد الحرام کی جانب منہ پھیرو تو وہ اس حکم کی کس طرح تعمیل کریں۔ شطر المسجد الحرام تو ان کو مغربی جانب ملی۔ مگر جانب کی جانب کے اور کیا معنی ہوں گے۔

اصل قانون | یہ ہے کہ "ولی یولی" میں جو در اصل مفعول اوّل ہوتا ہے اُس کو دوسرے کی طرف پھیرنے کا حکم ہوتا ہے (عربی زبان کے قواعد کی رُو سے ....) اس

قاعدے کے ماتحت ہم دو الفاظ قرآنی پیش کرتے ہیں جو ایک کے معنی ہیں وہی دوسرے کے۔ غور سے سنیے!

اول: من یولھم یومئذ دبرہ

دوم: فولوا وجوھکم شطرہ

پہلی مثال میں مفعول اول دراصل دبر ہے "ھم" ضمیر متصل ہونے کی وجہ سے پہلے آیا ہے، معنی اس کے یہ ہیں:

"جو کوئی اپنی دبر کافروں کی طرف پھیرے"

(اس پہ غضب ہے)

اسی طرح دوسری مثال کے معنی ہیں۔

"اپنے مونہوں کو مسجد الحرام کی جہت کو پھیر دو"

یعنی تمہارے ملک سے جس طرف کعبہ ہے اسی طرف کو رُخ کر لو بس یہی مدعا ہے۔ معلوم نہیں ایسا صاف اور صریح حکم ہوتے ہوئے بھی پیچ پیچ کر نا بر ہموازم کی تائید نہیں تو کیا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ اس جماعت قرآنیہ کے نزدیک نماز کی اصل حقیقت اتنی ہے کہ انسان کسی جگہ بھی یکسو ہو کر یہ کہے کہ:

اے اللہ تو پاک ہے۔ تو مالک الملک ہے میں عاجز بندہ ہوں، تو میرے حال پر رحم فرما اور میری حاجت پوری کر دے۔

بس نماز ہوگئی۔ اکیلا کہے تو نماز منفرد ہوگی چند اشخاص مل کر کہیں تو باجماعت ہوگی۔

یہی معنی ہیں :

ع کوئے جاناں سے خاک لائیں گے
اپنا کعبہ نیا بنائیں گے

ملّتِ اسلامیہ کی یکجہتی اور شطر مسجد الحرام ہیں جو تعلق ہے اُس کو جاننے والے منکرین کے ان ارشادات کا منشا سمجھ سکتے ہیں۔

۵

اہل قرآن اور اذان[۱]

"ناظرین! آج ہم بہت مدت بعد اہل قرآن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اتنی مدت ہیں شاید آپ بھول گئے ہوں کہ اہل قرآن کون ہیں؟ کیونکہ اہل قرآن ایک ایسا لقب ہے کہ ہر مسلمان اہلِ قرآن ہونا پسند کرتا ہے لیکن ان اہل قرآن اور عام اہل قرآن میں وہی فرق ہے جو اہل منطق کے نزدیک تصور بمعنی علم اور تصور ساذج ہیں فرق ہے۔

---

[۱] ۲۴ دسمبر ۱۹۲۶ء یوم جمعۃ المبارک اہلحدیث

پہلا عام ہے جو تصدیق کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے بلکہ تصدیق کو شامل ہے۔ دوسرا تصدیق کا قسیم ہے۔ یہی معنی ہیں اہلِ قرآن کے۔ عام معنی تو اس کے یہ ہیں کہ قرآن مجید کو کلام الٰہی ماننے والی قوم۔ اتنا مفہوم سب مسلمانوں پر صادق آتا ہے۔ مگر دوسرے معنی اہل قرآن کے یہ ہیں کہ فقط قرآن کا قائل گروہ۔ یعنی حدیث نبوی کی منکر جماعت، آج ہمارے مخاطب یہی لوگ ہیں۔"

اہل قرآن چونکہ مدعی ہیں کہ ہر مسئلہ قرآن مجید میں مذکور ہے حدیث کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن مجید مبین اور مفصّل ہے اس لیے وہ کوشش کرتے ہیں کہ ہر مسئلہ قرآن مجید سے نکالیں۔

چونکہ یہ کام اجتہاد اور استنباطی قوت سے کرتے ہیں اس لیے بسا اوقات ان میں آپس میں اختلاف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ نماز کے مسائل میں جو کچھ ان کا باہمی اختلاف ہے وہ اس وقت ہم نظر انداز کرتے ہیں اور صرف اذان کے مسئلہ پر آج توجہ کرتے ہیں۔

اہل قرآن پارٹی میں مسئلہ اذان کے متعلق ہم کو دو مذہب معلوم ہوئے ہیں۔ ایک لاہوری گروہ کا جن کے سرگروہ آج کل مولوی حشمت علی

صاحب ہیں جو کسی نماز یا دہلی میں قیام رکھتے تھے۔ دوسرا گروہ گوجرانوالیہ ہے جس کے سر گروہ آج کل مولوی محمد رمضان ہیں۔ پہلے گروہ کا اذان کے متعلق یہ مذہب ہے کہ آدمی اذان بیشک دے مگر کلمات اس کے الفاظ قرآنی ہوں چنانچہ مختلف سورتوں سے مختلف کلمات انھوں نے ایسے نکال رکھے ہیں جن میں نماز پڑھنے اور ذکر کی طرف آنے کا ذکر ہے۔ وہ ان سب کلمات کو مسجد کی چھت پر چڑھ کر بلند آواز سے پڑھا کرتے ہیں مگر خدا کی قدرت کہ ان میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں یہ ذکر ہو کہ سننے والو مسجد میں آکر باجماعت نماز پڑھو۔

ہم نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ خدا کی حکمت سے جو بلند سُر اور موزونیت اذان میں ہے وہ ان کلمات میں نہیں۔ اس کے بعد مولوی حشمت علی صاحب لاہوری دفتر اہل حدیث میں آئے اس وقت مولوی عبدالتواب صاحب غزنوی بھی بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے انھوں نے اذان کی سب آیتیں بلند آواز سے پڑھیں اور مجھے کہا کیا ان میں سُر نہیں؟ میں نے کہا تم خود ہی سوچ لو۔ کہاں یہ آواز

حی علی الصلوٰۃ حی علی الفلاح

اور کہاں یہ آواز

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ

اس کی بلندی اتنی نہیں ہو سکتی جتنی اذان میں ہوتی ہے (خیر) دوسرے گروہ نے اس سارے جھگڑے کا خاتمہ ہی کر دیا وہ کہتے ہیں کہاں کی اذان اور کہاں کے کلمات۔ میاں یہ تو کسی انسان کی آواز نہیں بلکہ آسمانی آواز ہے جس پر نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ آج ہم اس گروہ کے ماہوار رسالہ سے پوری عبارت دکھاتے ہیں جو بہت لطیف ہے۔ ہم نے اُس کو بہت لطیف پایا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ناظرین بھی لطف اُٹھائیں۔

کسی صاحب نے اُن پر سوال کیا تھا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے "اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے لیے ندا ہوتی تھی اس کے جواب میں جو کہا گیا وہ درج ذیل ہے:

"غرض ہے کہ قرآن کریم کے اس مقام میں ندا سے کوئی انسانی ندا ہرگز مراد نہیں ہے بلکہ ندا آسمانی مراد ہے جو ہر جگہ سنائی یکساں دیتی ہے۔ انسانی ندا تو ایک گاؤں یا ایک قصبہ کے احاطہ میں یکساں نہیں پہنچ سکتی جس سے انسان مکلّف حکم ربانی ہو سکے۔ جو تجربہ اور مشاہدہ

سے بھی ثابت ہے جب کہ انسان نے اس انسانی ندا کو
سنا ہی نہیں تو وہ صلوٰۃ میں کیوں آئے اور اس حکم کو کس طرح
ادا کرے جو اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا
مَّوْقُوْتًا ر پ ۵ ۔ ع ۱۲) ہے پس اس جگہ نُوْدِیَ سے مراد
وہ ندا ربانی آسمانی ندا ہی ہے جو ہر جگہ ہر فرد بشر کو ہوشیار
خبردار کر دیتی ہے جس سے ایک فرد بھی باہر نہیں ہو سکتا۔
اور نہ ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے یہ ندا سنی ہی نہیں اور
اس ندا ربانی سے ہر فرد بشر مومن صلوٰۃ کا مکلف ہو جاتا ہے
اور جو محیط الکل کا حکم رکھتی ہے۔ اب ایک اور دلیل سے
بھی اس جگہ انسانی ندا نہیں ہو سکتی وہ یہ ہے چونکہ حکم ہر
ایک مومن کے لیے یہ ہوا ہے کہ ندا سن کر صلوٰۃ کے لیے
آؤ اور کام کاج چھوڑ دو۔ قبل آواز سننے کے ایک مومن بھی
نہیں آسکتا معقول پسند اصحاب کو یہ بات تشویش میں
ضرور کر دے گی کہ وہ شخص جو دوسرے مومنین کو بلاتا ہے
وہ اُن مومنین میں سے کوئی الگ ہے کیونکہ آیہ مجیدہ نے
مومنین میں سے کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا اور نہ ہی کسی ایک
کے لیے تخصیص واقع ہوئی ہے جیسا کہ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی

الْاَرْضِ ..... الخ یعنی قصر صلوٰۃ میں پڑھانے والے ایک کو خاص کیا گیا ہے جو اِذَا کُنْتَ فِیْھِمْ فَاَقَمْتَ لَھُمُ الصَّلٰوۃَ کے حکم سے بین ہے کہ صلوٰۃ پڑھانیوالا پوری نماز یعنی دو رکعتیں پڑھے اور عام مومنین قصر نماز یعنی ایک ہی رکعت پڑھیں پس لفظ نودی میں کوئی خاص شخص ندا کرنے والا مخصوص نہیں کیا گیا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے کوئی پکارنے والے کلمات مقرر کیے ہیں جو وہ خاص ایک آدمی مومن اُس وقت اُن کلمات سے دوسرے مومنین کو پکارے پس وہ منادی جس نے اُس ایک مرد کو دوسرے مومنین کو بلانے کے لیے ندا کی ہے کیا وہی منادی دوسروں کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ وہ ایک فرد کو تو ندا کر سکے اور باقیوں کو نہ کر سکے۔ حالانکہ وہ ایک فرد بھی بغیر ندا کیے تو آ ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ بغیر ندا کیے آسکتا ہے تو یہ حکم یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃَ ..... الخ والا بے سود ہو جائے گا اور وہ شخص اس حکمِ خداوندی کا خود بے فرمان ہو گا کیونکہ اذا نودی کا ارشاد ہے یعنی جس وقت بلائے جاؤ تم جب اُس کو بُلایا

ہی نہیں گیا تو وہ آ کیسے سکتا ہے پس ثابت و ہیں ہوا کہ ندا ربانی آسمانی نشان کے اوقات معینہ ہی ہیں جو محیط الکل کا حکم رکھتے ہیں پس انسانی ندا محیط الکل ہرگز نہیں ہو سکتی لہٰذا اذان مروجہ کو دین اسلام میں کوئی دخل نہیں اور نہ قرآن کریم میں اس کے حکم کی چنداں ضرورت تھی"۔

بلاغ القرآن بابت اگست ستمبر، اکتوبر ۱۹۲۶ء صـ ۲۳-۲۴

اہل حدیث

اس سارے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ نودی میں منادی (ندا کرنے والا) کوئی انسان نہیں بلکہ اوقات سماویہ ہیں جن سے انسان خود بخود اوقات پہچان لیتا ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ اہل قرآن کہلا کر قرآن مجید سے اتنے بے خبر جتنا کوئی سبزی خور گوشت کے بھاؤ سے ناواقف ہو۔

اے جناب! سنئے ہم آیات قرآنی آپ کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اپنے خدا کو حاضر ناظر جان کر بتاؤ یہاں منادی کون ہے۔ ارشاد ہے:

اِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا

"جب تم مسلمان نماز کی طرف بلاتے ہو تو کافر ٹھٹول کرتے ہیں"
اس کا ترجمہ کرتے ہوئے اتنا بتا دیجیے گا کہ فانتم میں جو ضمیر "انتم" ہے اس سے کون مراد ہے مسلمان موذن یا آسمان زمین؟
ناظرین! ایسا صریح حکم جس کا فاعل مخاطب مسلمان کو بتایا گیا ہے اُس سے بھی انکار کیا جائے تو یہ کہنا بے جا ہوگا؟

گر تو قرآں بریں نمط خوانی
ببری رونق مسلمانی!

ہاں صاحب آپ کے سوال کا جواب دینا بھی ضروری ہے جو آپ نے اذان دینے والے کو معین شخص ماننے پر کیا ہے:
سنیے قرآن مجید میں اس کی مثل اور بھی ہے ارشاد ہے:

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ

(رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو)

بتائیے اس آیت میں ارکعوا کا حکم سب مسلمانوں کو ہے تو جن راکعین کے ساتھ مل کر رکوع کرنا ہے اُن کو یہ حکم کیسے ہو سکتا ہے؟ جلدی نہ کرنا سوچ سمجھ کر جواب دینا اور یہ سمجھ کر دینا کہ سامنے کون ہے۔ سنبھل کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

زراکو اوقات سے متعلق کرنے کے داعیہ کے باوجود نئی اذان
ایجاد کرنے کی خواہش ملاحظہ ہو۔

۱۴

اہل قرآن کی اذان![1]

ہمارے ناظرین جانتے ہوں گے کہ حدیث کے منکروں کا ایک گروہ ہے جنھوں نے اپنا نام "اہل قرآن" رکھا ہوا ہے۔ اس اہل قرآن کا جواب کئی دفعہ اہل حدیث میں دیا گیا۔ مگر چند روز سے بوجہ سفر یا دیگر مشاغل کے ادھر توجہ نہ ہو سکی۔ آج ان کا رسالہ نمبر ۱۳ جلد ۲ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ فرقہ بہت بڑی ترقی کر گیا ہے۔ یہ ترقی اس کو ہمارے دوست مولوی حشمت علی (سہ روزی)[2] کی معرفت حاصل ہوئی ہے

---

[1] اہلحدیث ۸۰ رجب ۱۳۴۳؁ھ یوم جمعۃ المبارک

[2] آپ کا خیال بلکہ اعتقاد ہے کہ رمضان شریف میں کل تین روزے فرض ہیں اس لیے آپ کو تمیز کے لیے سہ روزی لکھا گیا۔ جیسے ہمارے مہربان منشی قاسم علی خاں بانی مدرسہ لودہانہ کو ہم سہ صدی لکھا کرتے ہیں کیونکہ انھوں نے بھی لودھیانہ میں تین صد روپیہ علامت شکست میں ہم کو عنایت فرمایا تھا۔

ناظرین کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس فرقہ کا ہم (اہلحدیث) سے صرف دو مسئلوں میں اصولی اختلاف ہے۔ ایک یہ کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو حصول علم الٰہی کا ذریعہ قرآن مجید ہی تھا یا کچھ اور بھی۔

ہم اور کے مدعی ہیں لہٰذا ثبوت ہمارے ذمہ ہے جس کے دینے کو ہم ہر وقت تیار ہیں اور مدراس کے مباحثہ میں دے کر بفیصلہ منصفین سے ایک دفعہ ہم ڈگری لے چکے ہیں۔ پھر بھی اُسی طرح بہ تقرر ثالث باضابطہ گفتگو کرنے پر آمادہ ہیں۔

دوسرا اصولی اختلاف ہم دونوں میں یہ ہے کہ کسی قرآنی حکم کے لیے قرآنی الفاظ کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ اُس حکم کی تعمیل کے لیے بھی قرآنی الفاظ کی ضرورت جانتے ہیں اور ہم اُس حکم کی تعمیل کے لیے تعمیلی الفاظ کی تلاش قرآن ہی پر موقوف نہیں جانتے بلکہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فعلیہ، قولیہ یا محاورہ عرب سے بھی تلاش کرتے ہیں۔ اگر مل جائے تو کافی جانتے ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہے:

كَبِّرْهُ تَكْبِيرًا

"خدا کی تکبیر پڑھا کرو"

اس حکم کے تعلیمی الفاظ تو قرآن مجید میں مل گئے مگر تعمیلی الفاظ

نہیں ملتے کہ تکبیر کس طرح پڑھا کریں جن سے اس حکم کی تعمیل ہو سکے۔ اس لیے ہم سنت نبویہ علی صاحبہا الصّلوٰۃ والتحیہ کو دیکھتے ہیں تو ہم کو یہ ملتا ہے کہ حضور (فداہ ارواحنا) اس کی تعمیل میں کہا کرتے تھے:

اللہ اکبر

اور عرب کا محاورہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب کوئی کسی کو کہتا ہے (کَبِّرْ یا اَخِیْ) "اے بھائی تکبیر پڑھ" تو وہ اس کی تعمیل میں کہتا ہے:

اللہ اکبر

دوسری مثال سنیے کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے

صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

تم مسلمانو! نبیؐ پر صلوٰۃ وسلام بھیجا کرو!

اب اس صَلُّوْا اور سَلِّمُوْا کے حکم کے الفاظ تو قرآن مجید میں ملے مگر اُنکی تعمیل کے الفاظ نہیں ملتے جن سے معلوم ہو سکے کہ کس طرح ہم ان احکام کی تعمیل کریں۔ سنت اور محاورہ عرب سے ہم کو ثبوت ملتا ہے کہ اس کی تعمیل یوں ہے:

اللھم صل علیٰ محمد وسلم

برخلاف اس کے اہلِ قرآن ان احکام کے تعمیلی الفاظ بھی ، قرآن مجید ہی سے تلاش کرتے ہیں اور حسبِ استعداد خود نکالا بھی کرتے ہیں۔ جن کی آج مثال بتانے کو یہ مضمون لکھا گیا ہے قرآن شریف میں ذکر ہے :

اِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا

"جب تم مسلمان نماز کے لیے اذان دیتے ہو تو کفار اس کا تمسخر کرتے ہیں"

اس آیت میں چونکہ مسلمانوں کے اذان دینے کا ذکر آیا ہے ، اس لیے اہل قرآن پر سوال ہوتا رہا کہ اذان کے الفاظ قرآن مجید سے دکھاؤ۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی امام فرقہ اہلِ قرآن کو تو یہ الفاظ نہ ملے وہ تو یہی کہتے رہے کہ اذان سے مراد یہ ہے کہ تم جو لوگوں کو کہتے ہو کہ نماز کو چلو وغیرہ۔ مگر ہمارے سہ روزی دوست مولوی حشمت علی قائم مقام امام مذکور کو الفاظِ اذان مل گئے چنانچہ انھوں نے اپنے رسالہ نمبر مذکور میں اذان کے الفاظ لکھے ہیں ہم مولوی صاحب کی محنت کی داد دیتے ہیں اور ناظرین سے بھی سفارش کرتے ہیں کہ وہ بھی داد دیں اور اگر اُن کو مولوی صاحب کی محنت اور جان کاہی پر ہنسی آئے تو ہماری سفارش سے چند منٹ کے لیے ضبط فرمالیں۔

بہر حال وہ الفاظ یہ ہیں۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں:

"اذان کے کلمات جو آپ (حضرت ﷺ) اور آپ کے صحابہ کی زبان سے پانچوں وقت بغیر شک و شبہ کے نکلتے تھے وہ یہ ہیں۔ وہ اذان کے وقت اوّل یہ کہتے ہیں

۱۔ رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيٰطِيْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنَ (پ ۱۸ : ۶)

یعنی اے میرے پروردگار! میں شیطانی چھیڑ چھاڑ اور اُس کے وسوسوں سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں اور اُن کے حاضر ہونے سے بھی تیری پناہ چاہتا ہوں۔ یہ تعمیل آیت فاستعذ باللہ کی ہے۔ جس میں پناہ مانگنے کا حکم تھا۔

۲۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

(پ ۱۷ : ۱۷)

اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کیا کرو اپنے پروردگار کے سامنے قولاً اور عملاً اپنی شقاوت اور مریبق کو کمال سچائی سے اظہار کیا کرو اور بنی نوع انسان عموماً

اور اسلامی بھائی خصوصاً کی خیر خواہی کے کام کرو تاکہ
تم دارین میں کامیاب اور بامراد ہو۔

۳۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ
خَاشِعُوْنَ (پ ۱۸ : ۱)

۴۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ
اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ (پ ۲۹ : ۷)

تحقیق کامیاب وہی لوگ ہیں جو اپنی نمازوں میں
عاجزی کرتے ہیں۔

" " " " " " "

اور جو لوگ اپنی نمازوں کی متوسط طریق سے حفاظت
کرتے ہیں۔ وہ جنت میں بہت بڑی عزت سے
رہیں گے۔

۵۔ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ
اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ (پ ۹ : ۱۱)

جو لوگ حبل اللہ قرآن کریم سے تمسک کرتے ہیں
یعنی کتاب اللہ کی تعلیم کی ہوئی نماز پڑھتے ہیں، ہم
ایسے نیک لوگوں کی محنت کبھی ضائع نہیں کریں گے۔

۶۔ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ (پ ۲: ۱۵)

مسلمانو! محافظت کرو تمام نمازوں پر یعنی ہر ایک نماز وسطی حالت میں محفوظ رکھو۔ ان کا قیام، رکوع، سجود قومہ، جلسہ، قعدہ اذکارِ نماز اوسط حالت میں ادا کیا کرو اسی کا نام حفاظت ہے۔

۷۔ اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَیُسَبِّحُوْنَہٗ وَلَہٗ یَسْجُدُوْنَ (پ ۹: ۱۴)

بیشک جو لوگ تیرے پروردگار کے مقرب ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے کبھی تکبر اور بغاوت نہیں کرتے اور اُس کی تسبیح اور تقدیس اور تحمید نمازوں میں بیان کرتے ہیں اور صرف اسی کے آگے سربسجود ہوتے ہیں۔

۸۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَہَنَّمَ دَاخِرِیْنَ (پ ۲۴: ۱۱)

بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت (نماز وغیرہ) سے تکبر اور بغاوت کرتے ہیں وہ عظیم الشان ذلت

وارین میں داخل ہونے والے ہیں۔

۹۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ

(پ ۲۱ : ۷)

قرآنی نماز پڑھا کرو اور (نماز چھوڑ کر) مشرک نہ بنو۔

۱۰۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ

(پ ۲۱ : ۱)

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآنی نماز بے حیائی اور بدچلنی کے کاموں سے روک دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حضوری اور اطمینان قرآنی نماز سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ بڑا عالی شان جلیل القدر درجہ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے جو کچھ تم لوگ اس کی اطاعت یا بغاوت میں کام کرتے ہو۔

۱۱۔ سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَسَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(پ ۲۳ : ۹)

تمہارا رب العزت ہر ایک عیب اور نقصان سے

ہر طرح منزہ اور پاک ہے۔ وہ اپنی ذات اور صفات میں کامل اور اکمل ہے۔ تم اسی کی تقدیس اور تحمید نمازوں میں کیا کرو اور ہر ایک مرسل من اللہ پر دارین میں رحمت اور برکت ہے اور ہر قسم کی خالص تعریف اللہ تعالیٰ رب العالمین کے واسطے ہی مختص ہے جو ہر ایک مخلوق کی ربوبیت جسمانی اور روحانی بغیر کسی درخواست اور معاوضہ کے کرتا رہتا ہے اسی کو سجدہ کرنے کے لیے حاضر ہو کر اس کا تقرب حاصل کرو"

اہل حدیث

ماشاء اللہ چشم بد دور۔ تو آپ کی دلیل کا صغریٰ کبریٰ یوں ہوا:

۱۔ یہ آیات قرآن کی ہیں۔
۲۔ جو آیات قرآنی ہیں وہ اذان ہیں

نتیجہ: یہ نکلا کہ سارا قرآن اذان ہے۔

لہٰذا ایک ملّا قرآنی اذان میں اگر آیات مذکورہ پڑھ سکتا ہے تو دوسرا آیات ذیل بھی پڑھ سکتا ہے، مثلاً

تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ

تیسرا یہ پڑھ سکتا ہے

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ

چوتھا یہ پڑھ سکتا ہے۔

اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ

پانچواں یہ پڑھ سکتا ہے۔

وَیْلٌ لِّلْمُشْرِكِیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

غرض جتنے منہ اُتنی باتیں۔

لطیفہ:

اہل قرآن کو گو پیدا ہوئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ روز ہوئے ہیں مگر اسی آزادی کی بدولت انھیں بقول (دس قنوجی گیارہ چولھے) دنوں سے زیادہ فرقے بن گئے ہیں جن میں معمولی اختلاف نہیں بلکہ اصولی مخالفت ہے۔

۱۔ ایک فرقہ کہتا ہے اوراد نماز قرآن ہی سے مخصوص ہے دوسرا اُس کے خلاف ہے۔

۲۔ ایک فرقہ کہتا ہے نماز دو رکعتیں ہیں۔ دوسرا ایک پر ہی کفایت کرتا ہے۔

۳۔ ایک فرقہ کہتا ہے نماز میں رکوع ایک ہے سجدے دو ہیں۔
دوسرا کہتا ہے جس طرح رکوع کا حکم ہے سجدے کا بھی ہے
لہٰذا دونوں کا عدد ایک ہی ہے۔

۴۔ ایک فرقہ کہتا ہے روزے پورا مہینہ ہیں۔ دوسرا کہتا ہے تین
روزے ہیں۔ اب تو ہمارے دوست مولوی حشمت علی صاحب
کی طفیل ان فرقوں کا شمار اور بھی ترقی پر ہے۔

نوٹ:

فرقوں سے مراد کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہزاروں، لاکھوں آدمی ہوں
گے۔ نہیں کسی میں ایک ایک طرف ہے تو وہ بھی فرقہ ہے۔ دو
ایک طرف ہیں تو وہ بھی فرقہ ہے۔

تعجب ہے کہ آپس کی یہ حالت ہوتے ہوئے بھی جناب مولوی صاحب سہ روزی مسلمانوں کے اختلاف کو ان سب کی تکذیب پر دلیل لاتے ہیں چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"اسلامی فرقوں کا اختلاف جو اذان کے الفاظ اور ترتیب میں ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلامی فرقے ایک دوسرے فرقے کی اذان کے الفاظ اور ترتیب کو رسول اللہ سلام علیہ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور ترتیب

دی ہوئی آپ کی کو تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ ہر ایک فرقہ اپنے یقین سے یہی کہتا ہے کہ یہ اذان کے الفاظ اور ترتیب رسول اللہ کی نہیں ہے۔ ان کی اذان محض من گھڑت اور خانہ ساز اپنے اپنے اعتقاد سے بنائی ہوئی ہے"۔

حالانکہ اسلامی فرقوں میں اذان میں کوئی اختلاف نہیں، آپ کا قول بالکل غلط اور ناواقفی پر مبنی ہے۔ سب سے پہلے آپ نے شیعوں کا ذکر کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں :

اشہد ان علیا ولی اللہ

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کلیہ کی بابت معتبر کتب شیعہ میں لکھا ہے کہ یہ بدعت ملعون لوگوں کی ایجاد ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب من لا یحضرہ الفقیہ۔ اسی طرح اہل حدیث اور حنفیوں کے اختلاف کا ذکر بھی آپ نے بے محل کیا ہے۔ ان میں بھی دراصل کوئی اختلاف نہیں۔ احادیث میں جو آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی کو اذان کے کلمات سکھائے، جب

اشہد ان محمدا رسول اللہ

تعلیم کر چکے تو فرمایا پھر کہہ اس "پھر کہہ" کی تشریح میں اختلاف ہے

اہل حدیث اور شافعیہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ محمد رسول اللہ کہہ کر کلمہ

اشھد ان لا الہ الا اللہ

سے پھر شروع کرے۔ حنفی کہتے ہیں اُس نے ذرا پست آواز سے کہا تھا اس لیے اُس کو کہا پھر کہہ، یعنی بلند آواز سے کہہ۔ اہل حدیث کہتے ہیں الفاظ دہرانے کا حکم فرمایا۔ غرض الفاظ سب کو مسلم ہیں، تشریح میں اختلاف ہے۔ اس معمولی سے اختلاف سے اگر یہ نتیجہ برآمد کرنا صحیح ہے کہ اسلامی اذان من گھڑت ہے۔ تو آپ لوگوں کے اختلاف سے کیا نتیجہ نکلنا چاہیے۔ کہ آپ سب لوگوں کی نماز ہی من گھڑت ہے۔

مولوی صاحب!

؎ مشکل بہت پڑے گی برابر کی چوٹ ہے
آئینہ دیکھیے گا ذرا دیکھ بھال کر

عارفانہ نکتہ

ناظرین ان دونوں اذانوں (اہل حدیث اور اہل قرآن) کی بابت ایک نکتہ بتاتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ اذان سے مقصود یہ ہے کہ دور کے لوگ سنکر نماز کو پہنچیں۔ حدیثی اذان کے الفاظ میں مدات

کی وجہ سے ایسی بلندی پیدا ہو سکتی ہے جو مقصود کے موافق ہے۔
چنانچہ مؤذن جب کہتا ہے:

اللہ اکبر

حیّ علی الصّلوٰۃ وغیرہ

تو کافی دُور آواز چلی جاتی ہے۔

برخلاف اس کے مولوی قرآنی کی پیش کردہ آیات کو جہر سے بہر پڑھ کر بھی سنیں اتنی بلندی کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس سے عارفانہ نگاہ میں ثابت ہوتا ہے کہ خدائے پاک کو ان آیات کے الفاظ اذان میں استعمال ہونا منظور ہی نہیں۔ مولوی حشمت علی صاحب اگر عارف ہوں گے تو اس عارفانہ نکتہ سے فائدہ اُٹھائیں گے۔

منکرین حدیث کا رسالہ اشاعت القرآن ان دنوں بڑی سرگرمی سے حدیث پر حملہ آور تھا۔

۷

بہتان از اہل قرآن!

ناظرین آگاہ ہوں گے کہ فرقہ اہل قرآن (منکر حدیث) نے اپنے

لہ اہل حدیث ۳۰ جون ۱۹۲۲ء

رسالہ "اشاعۃ القرآن" میں ایک سلسلہ جاری کر رکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ احادیث قرآن کے برخلاف ہیں، لہٰذا غلط ہیں چنانچہ ۷ نمبروں تک اس کا جواب دیا گیا۔ آج نمبر ۸ کا جواب دیا جاتا ہے۔

نوٹ:

بہتان پہنچنے میں اُدھر ہی سے دیر ہوتی ہے، ہم تو ہمہ تن منتظر رہتے ہیں اور بزبان حال کہتے ہیں۔

؎ تیر پہ تیر چلاؤ تمھیں ڈر کس کا ہے!
سینہ کس کا ہے میری جاں، جگر کس کا ہے

قرآن مجید پارہ ۱۵، رکوع ۱۲ میں ارشاد ہے۔

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحَانَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا

"یعنی اے نبی! تو کہہ دے کہ تم (مشرکین عرب) اس قرآن کو مانو یا نہ مانو، جن لوگوں کو اس (قرآن) سے پہلے خدا کی طرف سے علم ملا ہے (یعنی علمائے یہود و نصاریٰ) اُن پر جب یہ قرآن پڑھا جاتا ہے تو ٹھوڑیوں پر گر پڑتے ہیں

اور کہتے ہیں سبحان ربنا "..... الخ
اِن آیات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مومن بندے جب قرآن مجید سنتے ہیں تو غفلت اور بے پروائی سے نہیں سنتے. بلکہ دِلی توجہ سے سن کر خدا کی طرف جھکتے ہیں، یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو زمانہ رسالت میں یہود و نصاریٰ کے عالم خدا سے ڈرنے والے تھے اس تفسیر کی تائید دوسری آیت میں یُوں ملتی ہے.

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (پ ۱۹ ع ۴)

یعنی خدا کے صالح بندے جب قرآن سنتے ہیں تو وہ بہرے اور اندھے ہو کر نہیں سنتے بلکہ بگوش ہوش اور بتوجہ قلبی سنتے ہیں۔

ایک مقام پر مومنین کے قرآن سننے کا نقشہ ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ

وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ

(پ ۷ : ۱)

اِن سب آیات کو یکجا مِلا کر پڑھیں تو یہ امر بخوبی ذہن نشین ہوتا ہے کہ ان آیات سے یہ مراد ہے کہ مومن بندے قرآن مجید سن کر اپنے نفس کو عمل پر آمادہ کرتے اور عامل پاتے ہیں چنانچہ ایک اور مقام پر ان سب کا نتیجہ ان لفظوں میں فرمایا ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ

خدا نے سب سے اچھا کلام (بصورت قرآن شریف) اُتارا ہے جو ملتا جُلتا ہے بڑا اثر کرنے والا جس کے سننے سے پروردگار سے ڈرنے والوں کے چمڑے کانپ اُٹھتے ہیں پھر وہ ان کے چمڑے اور دل اللہ کے ذکر کی طرف جھک جاتے ہیں۔

ہاں اسی آمادگی اور استعداد قلب کی حالت میں ان کے منہ سے کبھی سبحان ربنا نکل جاتا ہے کبھی ملک السموٰت پر غور کرتے ہوئے ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا پکار اُٹھتے ہیں۔ یہ الفاظ گو مختلف

ہیں معنی ان کے متحد ہیں بقول ؎

عبارتنا شتّٰی وحسنک واحد

"ہمارے الفاظ مختلف ہیں تیرا حسن ایک ہی ہے"

مولوی قرآنی نے اس آیت کا مطلب یہ سمجھا کہ نماز کے رکوع اور سجود میں سبحان ربنا کہنے کا حکم ہے اور یہ صحیح بخاری اس کے خلاف ہے چنانچہ اُن کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

"یعنی آیت صدر میں انبیاء و رسل سلام علیہم جن کو علم الٰہی پہلے دیا گیا تھا ان کا حال بتلایا ہے کہ جب ان کی جماعت میں قرآنی آیات کی تلاوت ہوتی تو وہ منہ کے بل رکوع اور سجدے میں گرتی اور کہتے سبحان ربنا یعنی ہمارا رب ہر طرح کے عیب و نقصان سے پاک ہے، اور ضرور ہی ہمارے پروردگار کے ہر ایک وعدے پورے کیے گئے ہیں۔ اس آیت سے یہ امر بخوبی ظاہر ہو گیا کہ پہلے انبیاء رکوع سجدہ میں قرآنی تسبیح ہی پڑھتے تھے جس کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان فرما کر ظاہر کر دیا کہ حسب الحکم فبھداھم اقتدہ یعنی کل رسل اور انبیاء کے رستہ کی اقتدا کیا کرو۔ اور رکوع سجدہ میں یہی تسبیح پڑھا کرو۔ جو وہ

پڑھتے تھے۔ لہٰذا محمد رسول اللہ سلام علیہ اور آپ کی جماعت صحابہ، مہاجر و انصار اپنے ہر ایک رکوع اور سجود میں یہی تسبیح موافق کتاب اللہ پڑھتے رہتے۔ بفحوائے آیت:

لَا تُکَلَّفُ اِلَّا نَفْسَکَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ (پ۵ ع۸)

یعنی اول قرآن پر خود عمل کرو اور پھر دوسروں کو وعظ کرو

اشاعۃ القرآن بابت جون ۱۹۲۲ء

اہل حدیث

بہت خوب اپنے معنی پر ہمارے سوالات بغور سنیے! اور ہماری طرح نفس قرآن سے ان کے جواب دیجیے۔

۱۔ آیت میں یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے،

"ٹھوڑیوں پر گرتے ہیں"

آپ نے جو اس آیت میں رکوع بھی داخل کیا ہے۔ کیا رکوع میں کوئی شخص ٹھوڑیوں پر گرتا ہے؟

۲۔ کیا جب کبھی قرآن مجید پڑھا جائے مومن کو چاہیے بقول آپ کے، رکوع، سجود میں گر پڑے؟

پھر تو کوئی شخص کھڑا رہ کر قرآن مجید نہیں سن سکتا حالانکہ آپ بھی نماز میں سورہ فاتحہ اور دوسری کوئی چھوٹی بڑی سورت پڑھتے ہوں گے۔ کیا آپ کے پڑھتے وقت آپ کے مقتدی سب رکوع سجود میں گرے ہوتے ہیں؟

۳۔ اس آیت سے پہلے نبیوں کا ذکر آپ نے کس طرح نکالا کس لفظ کا ترجمہ ہے؟ یخرون تو مضارع حال کا صیغہ ہے۔

۴۔ بقول آپ کے اس آیت میں سبحان ربنا کہنے کی تعلیم ہے تو کوئی شخص بجائے سبحان اللہ کہے تو آپ کے نزدیک گناہ گار ہوگا؟ ذرہ دوسری آیت سُبْحَانَ اللّٰہِ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ الآیۃ دیکھ کر جواب دینا۔

۵۔ آپ نے خود اور آپ کے امام مولوی عبد اللہ چکڑالوی نے بھی اپنی صلوٰۃ القرآن میں رکوع کی دعائیں یہ لکھی ہیں:

الحمد للہ الذی لم یتخذ ولدا ولم یکن لہ شریک فی الملک ولم یکن لہ ولی من الذل

ربنا اصرف عنا عذاب جہنم ان عذابہا کان غراما انہا ساءت مستقرا ومقاما

ربنا وسعت کل شیء . . . الخ

ربنا ھب لنا من ازواجنا الخ

اب بتائیں ان آیات کا رکوع سجود میں پڑھنا کس کس آیت سے استنباط کیا ہے۔ اگر آیت سے استنباط نہیں کیا تو اور شخص اور الفاظ پڑھ سکتا ہے؟

چونکہ آپ نے اس آیت کو یقیناً رکوع سجود کے متعلق سمجھا ہے لہٰذا آپ نے صحیح بخاری کی حدیث پر منہ کھول کر بڑی بے خفی سے اعتراض کیا چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

"بخاری صاحب نے قرآن کے خلاف قرآنی الفاظ کو ہی مقدم و مؤخر کر کے ایک ایسی تسبیح بنائی کہ جس سے قرآن مجید کی تحدی میں نقص پیدا ہو اور فاتوا بسورۃٍ من مثلہ میں جو قرآن کی مثل کا مطالبہ ہے وہ ٹوٹ جائے۔ ورنہ بخاری صاحب کو کیا ضرورت تھی کہ قرآنی تسبیح جو خدائے تعالیٰ کے کلام پاک میں موجود تھی اس کو چھوڑ کر اس کے مقابل انسانی صنعت سے تسبیح بناتے اور اس کی نسبت رسول اللہ کی طرف کرتے کہ عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم اپنے رکوع و سجود میں انسانی خانہ ساز تسبیح پڑھتے تھے اور اس کو قرآنی تسبیح ہی خیال کرتے تھے یا قرآنی تسبیح

بذریعہ جبریل جناب محمد رسول اللہ سلام علیہ کے پاس
آئی تھی۔ آپ کے لیے بحوالہ آیت ذیل کے کافی نہ تھی
اَوَلَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّا اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتَابَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ
(پ ۲۱ ع ۱)
لوگوں کے مقابل تو یہ اشتہار دیا جائے کہ اے لوگو!
کیا تمھارے لیے یہ قرآن کریم جو اعجازی رنگ میں نازل
ہوا ہے اور اس میں ہر ایک مسئلہ مکمل اور مفصل ہے اور
تم پر اس کی تلاوت، نماز اور غیر نماز میں عموماً فرض ہے۔
یہ کافی نہیں جو اس کے علاوہ کوئی انسانی مصنوعی بات
طلب کرتے تو اور اس کے مومن بنتے ہو اور قرآن مجید
تو ایماندار قوم کے لیے من جانب اللہ رحمت اور شفا اور نور
اور ہدایت اور امام الزمان ہے۔ بخاری صاحب نے
جس قدر غیر قرآنی اذکار نماز میں تحریر کیے ہیں وہ قرآنی الفاظ
کی ہی تحریف ہے تاکہ قرآن کریم کا وہ دعویٰ کہ "میں بے مثل
ہوں" ٹوٹ جائے اور تیس پارے بخاری کے قرآن مجید کے
تیس پاروں کی طرح اس کی مثل ہو جائیں چنانچہ بخاری کے

عاشق یہی ایمان رکھتے ہیں کہ بخاری مثل قرآن ہے اور قرآن مجمل ہے اور بخاری اس کی تفسیر ہے اور قرآن پر حاکم ہے"۔

اشاعۃ القرآن جون ۱۹۲۲ء

اہل حدیث

قربان ایسی سمجھ کے اور ایسی فہانت پر۔ آپ فرماتے ہیں امام بخاری نے قرآن کی تحدی توڑنے کا ارادہ کیا ہے (اف رے افترا)

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَیْرِ مَا اکْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُھْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا

سنیے جناب! حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں جو آپ نے بھی لکھے ہیں:

یکثر ان یقول فی رکوعہ وسجودہ سبحانک اللّٰھم وبحمدک اللّٰھم اغفرلی یتاول القرآن

یعنی بروایت حضرت عائشہؓ آنحضرت بہت دفعہ رکوع، سجود میں یہ دعا پڑھتے تھے جس کا ترجمہ یہ ہے "اے اللہ تو پاک ہے اپنی تعریف کے ساتھ۔ اے اللہ مجھے بخش دے اس میں تھے آپ قرآن پر عمل کرتے"۔ آپ روایت مذکورہ پر غور کرتے تو خوشی

مے پھولے نہ سماتے اور بجائے بدگوئی کرنے کے اچھلتے ہوئے کہتے کہ امام بخاریؒ بھی اہلِ قرآن تھے کیونکہ اُنھوں نے ان الفاظ کے پڑھنے کو قرآن سے مستنبط کیا ہُوا نقل کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں ان کا ماخذ قرآن مجید میں ہے اس لیے آنحضرت نے پڑھے اور امام بخاری نے نقل کیے۔

اب ہم دکھاتے ہیں کہ قرآن مجید میں کہاں ان الفاظ کا ماخذ ہے آؤ ذرا ہمارے استنباط کو اپنے خالی دعویٰ سے مقابلہ کر کے دیکھو کہ صحیح کون سا ہے ارشاد ہے:

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا

"خدا کے نام کی تسبیح پڑھا کرو اور بخشش مانگا کرو کہ بیشک وہ بڑا قبول کرنے والا ہے"۔

اس آیت میں دو کاموں کے کرنے کا حکم ذکر ہے تسبیح اور استغفار، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہی دو حکموں پر عمل کرنے کو رکوع سجود میں فرماتے:

سبحانك اللهم ربنا وبحمدك اللهم اغفرلی

کہیے! آیت پر عمل کیا کیا بُرا کیا؟ ہاں یہ کہا جائے گا کہ ہماری پیش کردہ آیت میں رکوع سجود کی تعیین نہیں پھر حدیث نے تعین کیوں کی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ غایت مافی الباب تعیین موضع نہ ہونے سے حکم عام رہے گا یعنی ہر مقام میں یہ الفاظ کہہ سکتے ہیں۔ اُن ہر مقام میں سے رکوع، سجود بھی تو ہے۔ نتیجہ صاف ہے کہ رکوع، سجود میں ان الفاظ کا پڑھنا تو بر محل ہے۔ البتہ دوسرے مقامات پر بھی پڑھے بلکہ جہاں تک ہو سکے۔ ہر وقت تسبیح اور استغفار کرے۔ کون مانع ہے۔"

حدیث سے ہٹ کر منکرین کو جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا اُن کا مختصر حال ملاحظہ ہو

۸

منکرین حدیث کی نماز[1]

منکرین حدیث کے رسائل کا جواب!

سر کنم شکوئی اگر تاب شنیدن داری
سینہ بشگافم اگر طاقت دیدن داری

ناظرین! آج تک تو منکرینِ حدیث کو ہم اہل قرآن کہتے اور لکھتے

---

[1] اہلحدیث ۱۳ر فروری ۱۹۲۵ء

تھے اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہتے تھے۔ آج کل چار رسالے منکرین حدیث کے نکلتے ہیں۔

۱۔ اشاعۃ القرآن لاہور سے

۲۔ بلاغ امرتسر سے

۳۔ بلاغ القرآن گوجرانوالہ سے

۴۔ حنیف لدھیانہ سے۔

ان میں سے ۲ اور ۴ نے کھلے لفظوں میں اہل قرآن کہلانے سے انکار کر دیا۔ باقی دو نے اب اپنا نام "اہل الذکر والقرآن" لکھنا شروع کیا۔ اور کاموں میں ان کا اختلاف کتنا ہی ہو مگر حدیث کے انکار میں سب شریک ہیں۔ اس لیے اہل قرآن اب ان کے لیے جامع لقب نہ رہا چونکہ انکار حدیث بلکہ ابطال حدیث مشترک کام ہے اس لیے ہم نے اس اشتراکی وصف کی وجہ سے سب کو یکجا کرنے کے لیے "منکرین حدیث" کا عنوان لکھا ہے۔ اس کے سوا ہیں کوئی اور غرض نہیں۔

اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ منکرین حدیثِ نبوی کو چھوڑ کر حیران پریشان ہیں اس حیرانی میں کچھ کا کچھ کہہ رہے ہیں۔ ان کی ابتدا سے آج تک کی کہانی قابلِ دید و شنید

ہے۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ "اہلحدیث" مورخہ ۴ جولائی ۱۹۲۴ء میں، پھر اس کے بعد مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۲۴ء میں ہم نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اہل قرآن اور اہلحدیث کی نزاع میں تنقیح بتائی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے:

"منکرینِ حدیث احکام اسلام کو قرآن مجید ہی میں مفصّل اور مشرح کہتے ہیں۔ اس لیے وہ احکام مندرجہ ذیل کی تفصیل اور تشریح دکھائیں وہ احکام یہ ہیں، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، اطاعت امیر، قوانینِ تعزیرات وغیرہ۔ سب سے مقدم نماز ہے، دیگر احکام بھی ضروری ہیں۔"

(۲۱ نومبر ۱۹۲۴ء)

اس درخواست کے بعد ہم نے "حنیف" کو (جس نے حدیثی صلوٰۃ سے انکار کرکے اسلامی نماز قرآن سے دکھلانے کا اعلان کیا تھا) مخاطب کرکے ۱۹ دسمبر کے اہلحدیث میں اسلامی نماز کا مطالبہ کیا۔ اس کے متعلق ہمارے الفاظ یہ تھے۔

"ہم دل سے متمنی ہیں کہ اسلامی حیثیت سے ہم اسلامی، (قرآنی) نماز سنیں پھر دیکھیں کہ جو نماز ہم مسلمان متوارث پڑھتے

چلے آئیے ہیں، قرآن مجید اس کی شہادت دیتا ہے یا نئی نماز
کی" (اہلحدیث ۱۹ر دسمبر ص ۳)

ہماری اس معقول درخواست پر منکرین حدیث کا رسالہ "بلاغ القرآن" گوجرانوالہ نہایت غلط نتیجہ نکالتا ہوا لکھتا ہے۔

"اگر جناب (اہلحدیث) کا اپنی نماز پر وثوق اور ایمان ہوتا تو آپ بیتاب ہو کر درخواستیں نہ بھیجتے اور نہ لکھتے کہ (دیکھیں کہ جو نماز ہم مسلمان متوارث پڑھتے آئے ہیں قرآن اس کی شہادت دیتا ہے یا نئی نماز کی"؟ (جنوری ص ۳۱)

اہلحدیث اے جناب! ہماری درخواست تعلیم قرآنی کے ماتحت ہے، جو ارشاد ہے۔

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَا اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (پ۲۰ ۸۶)

"اے رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام)، تو مخالفوں کو کہہ دے توریت اور قرآن سے زیادہ اچھی ہدایت والی الٰہی کتاب لاؤ تو میں اُسی کی پیروی کروں گا"

کیا حضور (فداہ ابی و امی) کو بھی قرآن مجید پر ایمان نہ تھا جو دوسری کتاب مانگ رہے ہیں۔ اے جناب! علم بیان میں اس کو

تعجاہز کہتے ہیں۔

اہل قرآن کھلا کر قرآنی تعلیم سے ناواقفی اور اُس پر اعتراض؟

گر تو قرآں بدیں نمط خوانی!

ببری رونقِ مسلمانی!!

بلاغ امرتسری نے اس سے بھی زیادہ گل کھلائے۔ حالانکہ اُس کو ہماری درخواست کی قدر کرنی چاہیے تھی۔ کیونکہ اول مخاطب وہی تھا اُس نے ہماری نسبت ایسے ایسے الفاظ لکھے جو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھے کہ بلاغ جیسا متین نگاری کا مدعی ایسا لکھے گا اُس نے شروع تمہید میں صراحتًہ اور اشارۃً چودہ مرتبہ لکھا کہ اہل حدیث قرآن کو ناقص کہتا ہے چنانچہ پہلی دفعہ کے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"اڈیٹر اہلحدیث ۱۲ نومبر میں "بلاغ" سے دریافت فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

اگر قرآن مجید مفصل مشرح اور مکمل ہے تو اس میں نماز، روزہ، حج وغیرہ احکام کی فہرست پیش کرو۔

مولوی صاحب بجائے قرآن کو ناقص ماننے کیا مطالبہ ہماری

سمجھ میں نہیں آیا"

۱۵ دسمبر ۳۶ئ لغایت ص۱۱

اہلحدیث — مورخہ ۱۲ نومبر میں ہم کو تو یہ لفظ نہیں ملے جو اڈیٹر صاحب "بلاغ" نے ہماری نسبت لکھے ہیں چنانچہ ہم نے شروع مضمون میں اہل حدیث ۱۲ نومبر سے اصل مطالبہ کے الفاظ نقل کر دیئے ہیں۔ اڈیٹر صاحب بلاغ کو اگر ملے ہوں تو مہربانی کر کے آئندہ پرچے میں نقل کر دیں جس میں قرآن مجید کے ناقص اور غیر مکمل ہونے کا ذکر ہو[1] اور اگر یہ الفاظ ہماری کسی تحریر میں نہ ملیں تو دوسری مہربانی یہ کریں کہ اس آیت قرآنی کی تفسیر فرما دیں جو یہ ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا

(پ ۲۲ ع ۶)

ترجمہ ہم کیے دیتے ہیں، تفسیر آپ کے سپرد کرتے ہیں۔

(یعنی) "جو لوگ کسی مومن کو بغیر گناہ کیے کے ایذا دیتے ہیں، وہ بہت بڑا بہتان اور واضح گناہ اپنے ذمہ لیتے ہیں"۔

---

[1] انکار حدیث کے جدید علمبردار آج بھی اسی روش پر گامزن ہیں۔ مؤلف۔

اڈیٹر صاحب بلاغ!

بہ روز حشر پرسند خسرو را چرا کشتی!
چہ خواہی گفت قربانت شوم تا من ہماں گویم

اصل یہ ہے کہ اڈیٹر صاحب بلاغ کو شاید معلوم نہیں کہ ناقص اور مجمل، بکمل اور مفصل میں کیا فرق ہے اس لیے ہم اس کی وہ مثالیں پیش کرتے ہیں۔ علامہ ابن حاجب نے "کافیہ" میں کلمہ کی تعریف یوں کی ہے:

الکلمۃ لفظ وضع لمعنی مفرد

اس تعریف کی تفصیل شارح جامی نے کئی سطروں میں کی ہے۔ مگر مگر مصنف "تہذیب النحو" نے علامہ موصوف کی تعریف کو بجائے خود مفصل جان کر اس کو یوں مجمل کیا:

الکلمۃ لفظ "موضوع"

علماء نحو سے پوچھیے کہ مصنف "تہذیب النحو" کی تعریف ناقص ہے یا جامع مگر مجمل۔

غالباً آپ کو یہ مثال سمجھنے میں دقت ہوگی کیونکہ یہ ایک ایسے علم کی مثال ہے جس سے اڈیٹر صاحب غالباً واقف نہیں۔ اس لیے قرآن مجید ہی سے مثال پیش کی جاتی ہے:

کچھ شک نہیں کہ مسئلہ توحید کی جو تفصیل قرآن مجید نے کی ہے کسی کتاب نے نہیں کی۔ اس ساری تفصیل کے دریا کو کلمہ شریف

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

کے کوزہ میں بند کر دیا۔ ہمارے اس دعوے کی تصدیق ہمارے رسالہ "کلمۂ طیبہ" سے کیجیے۔ تو کیا کلمہ لا الہ الا اللہ توحید کے بیان میں ناقص ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہاں مجمل ضرور ہے۔

ان دو مثالوں سے اہل انصاف سمجھ سکتے ہیں کہ ہم نے جو کہا تھا کہ احکام شرعیہ کے بیان کرنے میں قرآن شریف مجمل ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن ناقص ہے جیسا کہ اڈیٹر صاحب "بلاغ" نے ہم پر افترا کیا ہے اور ان کے امام جی نے بعض احباب سے زبانی بھی ذکر کیا ہے۔ سچ ہے

کم من عائبٍ قولاً صحیحاً

وآفتہ من الفہم السقیم

رجوع بمطلب | یہ تو ہے تمہید۔ اب ہم اصل مطلب کی بات کہتے ہیں۔

انکار حدیث کی آواز ہندوستان میں سب سے پہلے سر سید احمد خاں بانی علی گڑھ کالج نے اٹھائی تھی جن کے مقابل اس وقت

بھی گروہ اہل حدیث رہا چنانچہ مولانا ابوسعید محمد حسین بٹالوی مرحوم نے لگاتار مضامین اشاعت السنہ میں لکھے جن کی سُرخی تھی "نیچری اور حدیث نبوی" مگر باوجود انکار کے سرسید مرحوم میں یہ بات خاص تھی کہ وہ عبادات اور ارکان میں اُسی طریق کے قائل تھے جو متوارث اہلِ اسلام میں چلا آیا ہے یعنی نماز وغیرہ اسی طرح ادا کرتے تھے لیکن جب یہ آواز مولوی عبداللہ چکڑالوی کی معرفت پنجاب میں آئی اور منکرین حدیث ایک جماعت کی صورت میں نظر آنے لگے تو انھوں نے نماز وغیرہ احکام بطرز جدید جاری کیے۔ آخر کیوں؟

نہ پیروئ قیس نہ فرہاد کریں گے
ہم طرزِ جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

چنانچہ مولوی عبداللہ چکڑالوی (اوّل منکرین حدیث پنجاب) نے ایک نماز کی کتاب شائع کی جس کا نام رکھا "صلوٰۃ القرآن او علم الرحمٰن بایات الفرقان" اس نام ہی سے ظاہر ہے کہ جو کچھ اس میں تعلیم ہے وہ مصنف کے نزدیک بمبنیہ قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔ بہرحال وہ ترتیب ارکان یہ ہے:

۱۔ قیام میں داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ کی کہنی تک ملا کر دونوں دل پر رکھے جائیں۔

۲۔ رکوع
۳۔ قومہ میں قیام کی طرح ہاتھ باندھے جائیں۔
۴۔ سجدہ اول
۵۔ جلسہ
۶۔ سجدہ دوم
ان چھ ارکان پر مع ان کے اذکار کے جو بعد میں آئیں گے ایک رکعت ختم ہوتی ہے۔
۷۔ قعدہ دو رکعتوں کے بعد کیا جائے۔
۸۔ ہر رکن کے شروع کرنے کے وقت تکبیر کہی جائے جس کے ساتھ ہی مجرموں کی مانند دونوں کان پکڑے جائیں۔
۹۔ سلام دائیں بائیں طرف کا جو آخری قعدہ کے اخیر ہوتا ہے"
(صلوٰۃ الرحمٰن مولوی عبداللہ صاحب)

یہ ہے ترتیب ارکان جو قریب قریب وہی ہے جو قائلین حدیث کہتے ہیں۔ منکرین حدیث کے قلم سے حدیثی تعلیم دیکھ کر بے ساختہ منہ سے نکلتا ہے۔

منکر می بودن او ہم رنگ مستان زیستن

اب سنیے تعداد رکعات

فجر	دو فرض
ظہر	چار فرض
عصر	چار فرض
مغرب	تین فرض
عشاء	چار فرض
جمعہ	دو فرض
عیدین	دو۔ دو فرض
تہجد	دو نفل " (بحوالہ بالا صد ۸)

اس کے بعد اوقاتِ نماز لکھے ہیں جو عام طور پر اہلِ اسلام خصوصاً اہلِ حدیث میں ہیں۔ پھر اذکارِ نماز لکھے ہیں:

تکبیرِ اولیٰ:

وَاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ

قیام کی دعاؤں کو دو حصوں میں تقسیم کیا، فرضی اور نفلی

فرضی:

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ (آخر تک)

نفلی:

عَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلْنَا (آخر تک مع فاتحہ)

تکبیر رکوع :

وہی تکبیر اول وَاَنَّ اللّٰہَ ۔۔۔ آخر تک

ذکر رکوع :

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّتِ ۔۔۔ آخر تک

سجدہ :

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وغیرہ

اخبار اہل حدیث ۲۲ جنوری ۱۹۰۴ء میں اس نماز پر تنقیدی مضمون نکلا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ نے جو موقع بموقع آیات لکھی ہیں کس کے حکم سے لکھی ہیں۔ کیا قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ ان ارکان میں یہ آیات پڑھا کرو؟ نیز تکبیر تحریمہ کے لیے جو یہ آیت رکھی ہے

وَاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ

اس میں حرف واو سے عطف کس پر ہے اور اَنَّ منصوب کا تعلق کس کلام سے ہے۔ وغیرہ

اس اعتراض سے بچنے کے لیے یہ انتظام کیا گیا کہ طبع دوم، "صلوٰۃ القرآن" میں بجائے مذکورہ الفاظ کے یوں ترمیم کی گئی۔

مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہِ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ

(ص ۱۰)

اس ترمیم سے حرف عطف کا سوال تو نہ رہا مگر قرآن کے دیکھنے سے اور بھی مشکل سوال پیدا ہو گیا کیونکہ قرآن مجید میں مایدعون سے پہلے خود حرف عطف اور اَنَّ مفتوحہ لکھا ہے۔ ساری آیت یوں ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ

نوٹ:

ہمارے دوست مولوی حشمت علی صاحب سہ روزی قائم مقام مولوی عبداللہ چکڑالوی نے بھی اس چکڑالوی ترتیب کو بحال رکھا ہے ملاحظہ ہو اُن کی صلوٰۃ القرآن مطبوعہ ہلالی پریس دہلی ۱۹۱۵ء۔ اگر موصوف قرآن مجید کو کھولنے کی تکلیف کرتے تو اُنھیں صاف معلوم ہو جاتا کہ آیت موصوفہ کو تکبیر تحریمہ کی جگہ پڑھنے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

گوجرانوالیہ جماعت (منکرین حدیث) نے اس سے آگے ترقی کی۔ اُن کے اس بارہ میں تین رسالے میری نظر میں ہیں ایک کا نام ہے "اقیموا الصلوٰۃ" دوسرے کا نام ہے "قرآنی نماز" تیسرے کا نام ہے "اوقات الصّلوٰۃ"۔

اُنھوں نے اوقات نماز بجائے پانچ کے صرف تین رکھے ہیں (۱) صبح (۲) بوقت دلوک شمس جو بقول اُن کے مغرب تک ہے۔

(۳) بعد غروب آفتاب غروب شفق تک نماز عشاء ادراس اور رکعتیں بھی ہر نماز کی دو ہی رکھی ہیں (رسالہ اقیموا الصلوٰۃ)۔ اذکار نماز میں بھی اپنے پیش رو مولوی عبد اللہ چکڑالوی سے بہت کچھ اختلاف کیا ہے۔ مثلاً تکبیر کی جگہ یہ آیت رکھی ہے

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیْرًا

اسی طرح اذکار قیام۔ اذکار رکوع اور اذکار سجدہ سب میں اختلاف ہے اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ جو مسئلہ خیالی یا اجتہادی ہو اس میں اختلاف ہونا لازمی ہے۔ ممکن ہے ابھی اور بھی اختلاف ہو۔ چنانچہ سنا جاتا ہے کہ ان میں چند لوگ ایسے بھی ہیں جو ہر نماز میں ایک ہی رکعت کے قائل ہیں اور ایسے لوگ بھی ان میں پیدا ہو گئے ہیں جو ایک رکعت میں ایک سجدہ کے قائل ہیں۔ لاہور کے جلسہ اہل قرآن میں ان کا باہمی مباحثہ بھی ہوا تھا جس کے صدر مولوی احمد الدین صاحب امرتسری جماعت کے سرگروہ تھے۔ بقول

مختسب را درون خانہ چہ کار

ہم کو منکرین حدیث کے اندرونی اختلاف سے کیا مطلب ہمارا روئے سخن تو سب سے یکساں ہے اور ان سب پر سوال ایک ہی ہے کہ آپ لوگوں نے جو ترتیب اور اذکار نماز میں رکھے ہیں، یہ بحکم خدا

ہیں یا ایجاد بندہ؟ حکم خدا ہے تو اس حکم کے الفاظ بتائیں جس میں مذکور ہو کہ نماز کی رکعات اتنی ہیں، تکبیریں اتنی، اذکار یہ ہیں وغیرہ اور اگر ایجاد بندہ ہے تو

"تعلیم نبوی اس سے بدرجہا افضل ہے"

منکرین کا منشا ہی تعلیم نبویؐ کو نقصان پہنچانا ہے۔

۹

منکرین حدیث کا تیسرا فرقہ[1]

ان کا تیسرا فرقہ امرتسری ہے جس کا آرگن رسالہ "بلاغ" ہے۔ ۲۱ر نومبر ۱۹۲۴ء کے اہلحدیث میں ہم نے اسی بلاغ پر سوال کیا تھا کہ نماز کے احکام مفصّل اور مشرّح قرآن مجید سے دکھائیے اس سوال کے جواب میں اُس نے دسمبر اور جنوری کے پرچوں میں جو مضمون نماز کے متعلق لکھا ہے حقیقت میں وہ ہمارے ہی سوال کا جواب ہے اس لیے ہم ہی اس جواب کی قدر کریں گے دوسرا کون؟

ع بلائیں زلف جاناں کی اگر لیں گے تو ہم لینگے

بلاغ نے شروع تمہید میں اپنا عقیدہ ان لفظوں میں بتایا ہے:

[1] اہلحدیث ۲۰ فروری ۱۹۲۵ء

"قرآن مجید میں نماز، روزہ وغیرہ امور کا ذکر بالوضاحت موجود ہے، خداوندِ کریم نے جو احکام مناسب سمجھے اور پسند کیے وہ سب بتفصیل اپنی مقدس کتاب میں لکھ دیے"

(بلاغ بابت دسمبر ص ۱۲-۶)

یہ بھی صاف لکھا ہے کہ:

"بلاغ" احادیث کو حجت شرعی نہیں مانتا نہ ہی اُن کے عمل کو قرآنی احکام کے مثل واجب العمل جانتا ہے"

(ص ۸)

اس تمہید کے بعد ایک مضمون مستقل "بلاغ" میں درج ہے جس کا نام ہے "ایات بینات فی حقیقۃ الصلوٰۃ" یہ مضمون مرقومہ مفتی محمد الدین صاحب وکیل گجرات پنجاب ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فاضل مضمون نگار نے بڑی سلامت روی سے اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے اُس کے ساتھ اگر پابندیٔ اوقات قیام، رکوع، سجدہ وغیرہ ہے تو متعارف[1] نماز ہے ورنہ محض دعا، چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

---

[1] یعنی جس کو مسلمان نماز پنج گانہ کہتے ہیں (اہلحدیث)

"مذکورہ بالا چہار شرائط یعنی پابندی اوقات، طہارت، سورہ فاتحہ اور اعتدال صوت کے ساتھ ایک قیام ایک رکوع اور دو سجدہ کا نام رکعت ہے۔ ایسی دو رکعت صلوٰۃ کے معینہ اوقات میں ادا کرنی فرض ہیں" (ص ۱۸، ۱۹)

مطلب اس عبارت کا یہ ہے کہ شرعی نماز یہ ہے۔ اوقات معینہ (صبح، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء) میں بعد وضو کے قیام کرے سورہ فاتحہ پڑھے۔ رکوع کرے اور سجدہ کرے تو ایک رکعت پوری ہوگئی۔

بالکل ٹھیک ہے آمنا وصدقنا مگر سوال یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کا پڑھنا کس آیت سے ثابت ہے؟ سجدوں میں تعدد کسی آیت سے ثابت ہے تو وہ پیش کریں اور اگر اپنا استنباط ہے تو اڈیٹر صاحب "بلاغ" کا یہ قول کہ

"نماز کا حکم بالوضاحت اور بالتفصیل قرآن مجید میں مذکور ہے"

قابلِ تصدیق نہ رہا۔

علاوہ ازیں اگر آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی آیت سے غامض حکم استنباط کر سکیں جزو صلوٰۃ بنا دیں تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم

کو یہ حق کیوں حاصل نہیں کہ وہ بھی کسی ایسے ایک حکم کو داخل نماز فرمائیں جو امت کی نظروں سے قرآن میں اوجھل ہو یا سرے سے قرآن میں نہ ہو مگر بارشاد الٰہی حکم فرمائیں بحالیکہ حضور علیہ السلام میں اور امت کے افراد میں روحانی اور قرب الٰہی کے مراتب میں زمین و آسمان سے زیادہ فرق ہو۔ سچ فرمایا:

اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ

نوٹ:

فاضل مضمون نگار نے (جن کی تحریر کو اڈیٹر صاحب "بلاغ" نے ہمارے جواب میں کافی جان کر درج کیا ہے اُنھوں نے) تو سورہ فاتحہ کا پڑھنا ضروری قرار دیا۔ مگر اڈیٹر صاحب خود اس کے برخلاف، لکھتے ہیں چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں۔

"پھر خدا نے فرمایا نماز میں قرآن پڑھو۔ اس کی وسعت بھی اہل ذکر کے لیے مایہ صد ناز ہے اس کی خوبیوں کے اعتراف لکھنے کے لیے دفتر بکار ہیں۔ قرآن مجید میں خدا کی حمد تقریباً ہر ایک رکوع میں موجود ہے۔ اپنی ضروریات کے پیش کرنے کے طریقے بلکہ الفاظ موجود ہیں جہاں سے چاہو جتنا چاہو جو بھی حفظ ہو پڑھو۔ سبحان اللہ و بحمدہ کیسا مفصل مکمل اور

مشرح کلام خوش نظام ہے" صـ۹

اہلحدیث:

ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کیسا مفصّل اور مشرّح ہے کہ ہم قائلین حدیث تو بجائے خود (جن کو بقول اڈیٹر بلاغ وحی خفی (حدیثوں) نے مغالطے میں ڈال رکھا ہے) منکرین حدیث (کے ہاں قرآن مجید کو مفصل اور مشرح کہنے والوں کے ایک اعلیٰ ممبر مفتی محمد الدین صاحب گجراتی) سے بھی یہ تفصیل اور تشریح مخفی رہی جنھوں نے برخلاف رائے اڈیٹر صاحب "بلاغ" خصوصاً سورہ فاتحہ کا پڑھنا جزو نماز قرار دیا۔ صدق اللہ

شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ اَهْلِهَا

سورہ فاتحہ کا ثبوت:

یہاں تک ہم لکھ چکے تھے کہ "بلاغ" بابت جنوری پہنچا جس میں فاضل مضمون نگار نے خصوصاً سورہ فاتحہ پڑھنے کا ثبوت دیا، خلاصہ اُس ثبوت کا یہ ہے کہ قرآن مجید میں دو جگہ استعینوا کے صیغہ امر سے طلب اعانت کا حکم آیا ہے اور سورہ فاتحہ میں نستعین کا صیغہ ہے اس لیے سورہ فاتحہ ضرور پڑھنی چاہیے چنانچہ آپ کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"صلوٰۃ میں طلب اعانت کے واسطے بہ تعمیل آیت

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلوٰةِ

سورہ فاتحہ کے پڑھے جانے کا ثبوت یہ ہے کہ طلب اعانت کے واسطے نستعین کے لفظ کے سوا جس کے معنی ہیں "اے خدا! ہم تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں" اور جو سورہ فاتحہ میں ہے اور کوئی لفظ قرآن مجید کی کسی آیت میں مذکور نہیں ہے نستعین کا لفظ سوائے سورہ فاتحہ کے اور کسی جگہ قرآن مجید میں نہیں ہے اور استعینوا کا لفظ دو دفعہ قرآن مجید میں آیا ہے اور دونوں دفعہ صلوٰۃ کے ساتھ مذکور ہوا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ استعانت کے واسطے جو صلوٰۃ کا ایک خاص مقصد ہے سورہ فاتحہ پڑھنے کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے"۔

(بلاغ بابت جنوری ص ۲۴)

اہلحدیث:

ہم اس تحقیق اور تدبر فی القرآن کی داد دیتے ہیں اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ کوئی جماعت تو پیدا ہوئی جو قرآن مجید پر تدبر کرنا اپنا فرض جانتی ہے۔ خدا نے چاہا تو یہی ان کا فعل حسن ان کو قرآن مجید کا اصل منشا یعنی اتباع اسوۂ حسنہ کی طرف کھینچے گا۔

ہاں جناب! قرآن مجید میں استعینوا کا لفظ دو دفعہ نہیں بلکہ تین دفعہ آیا ہے۔ دو مقام آپ نے پیش کیے ہیں تیسرا ہم سے سُن لیجیے!

قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَاصْبِرُوْا

(پ ۹ ع ۵)

"حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو کہا اللہ سے استعانت کرو (مدد چاہو) اور صبر کرو"

اس تیسرے موقع پر نماز سے تعلّق نہیں۔ شاید اسی لیے آپ نے اس کو شمار میں نہیں لیا۔ سارا مدار آپ کے ثبوت کا اس فقرے پر ہے "طلب استعانت کے واسطے نستعین کے لفظ کے سوا جس کے معنی ہیں "اے خدا ہم تجھ سے مدد طلب کرتے ہیں" اور کوئی لفظ قرآن مجید میں نہیں" (بلاغ جنوری ص۲۴)

ہم نے آپ کے اس دعویٰ کو غور سے دیکھا اور پڑھا، تو واللہ اس سے، بہت اچھے اور جامع الفاظ ہم کو قرآن میں دوسری جگہ ملے جو ہم پیش کرتے ہیں، مگر اُن کے پیش کرنے سے پہلے ایک امر کا اظہار کرنا ضروری ہے جو یہ ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ سورہ فاتحہ پڑھنے کے متعلق اہلحدیث کا مذہب آپ سے زیادہ مضبوط اور وسیع ہے کیونکہ آپ نے ان معنوں میں

مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنے سے روک دیا ہے (بلاغ بابت جنوری ص ۴۸) مگر اہلحدیث مقتدی پر بھی سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری جانتے ہیں۔

اس لحاظ سے تو اہلحدیث آپ کے مشکور ہیں کہ آپ نے اُن کے مذہب کی گو ساری نہیں ادھوری سی تائید کی، مگر بحث صرف وجہ ثبوت میں ہے کہ سورہ فاتحہ پڑھنے کا ثبوت قرآن سے ہے یا حدیث نبوی سے۔ اہلحدیث حدیث نبوی سے ثبوت پیش کرتے ہیں جس کے الفاظ صاف ہیں:

لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَاب (الحدیث)

"نماز بغیر فاتحہ کے وجود پذیر نہیں ہوتی"

مسئلہ تو حدیث کا ماننا اور حدیث سے انکار کرنا ... ع

منکر می بودن و ہم رنگ مسلمان زیستن

اصل مطلب:

مطلب کی بات یہ ہے کہ آپ کو مدد طلب کرنے کے الفاظ قرآن میں نہیں ملے اس لیے ہم وہ الفاظ پیش کرتے ہیں جو بغور دیکھیں تو سورہ فاتحہ سے بہت وسیع اور جامع نہیں غور سے سنیے:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا

وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا
وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ
الْكٰفِرِيْنَ (پ ۳ ع ۸)

"اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ہم کو (اس کے وبال میں) نہ پکڑ۔ اور اے ہمارے پروردگار جو لوگ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں جس طرح ان پر تو نے (اُن کے گناہوں کی پاداش میں احکام سخت کا) بار ڈالا تھا۔ ویسا بار ہم پر نہ ڈال۔ اور اے ہمارے پروردگار اتنا بوجھ جس (کے اُٹھانے) کی ہم کو طاقت نہیں ہم سے نہ اُٹھوا۔ اور ہمارے قصوروں سے درگذر اور ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم پر رحم فرما تو ہی ہمارا (حامی و) مددگار ہے تو ان لوگوں کے مقابلہ میں جو کہ کافر ہیں ہماری مدد کر۔

اس دعا کے الفاظ سورہ فاتحہ کی دعا سے کتنے وسیع اور کتنے جامع ہیں اور خاتمہ اس دعا کا طلب مدد پر ہے اس لیے اس دعا کو سورہ فاتحہ پر (بحیثیت الستعانت) کے ترجیح ہے۔ نیز آپ ان آیات میں سیاقِ عبارت قرآنی کو دیکھیں تو آپ کو مزید ترجیح یوں ملے گی کہ اس دعا کے پڑھنے والوں کی اس سے سابقہ آیات میں تعریف ہے بلکہ یوں

سمجھیے کہ یہ دعا الہامی طور پر پڑھنے کی تلقین ہے جس میں ضمناً "قبولیت" کا وعدہ ہے چنانچہ ابتدا آیت کا یوں ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

(ہمارے یہ) پیغمبر (محمدؐ) اُس کتاب کو مانتے ہیں جو ان کے پروردگار کی طرف سے اُن پر اُتری ہے اور (پیغمبر کے ساتھ دوسرے) مسلمان بھی (یہ سب کہے) سب اللہ اور اُس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لائے کہ (سب پیغمبروں کا دین ایک ہے اور کہتے ہیں کہ) ہم خدا کے پیغمبروں میں سے کسی ایک کو (بھی) جدا نہیں سمجھتے (یعنی سب کو مانتے ہیں) اور بول اُٹھے کہ (اے ہمارے پروردگار!) ہم نے (تیرا ارشاد) سُنا اور تسلیم کیا۔ اے ہمارے پروردگار! (بس) تیری ہی مغفرت درکار ہے) اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ کسی شخص پر بوجھ نہیں

ڈالتا مگر اُسی قدر جس کے اُٹھانے کی اُس کو طاقت ہو جس نے اچھے کام کیے تو (ان کا نفع بھی اُسی کے لیے ہے) اور جس نے برے کام کیے (اُن کا وبال بھی) اُسی پر۔

اس کے علاوہ انہی معنی کی دعا گذشتہ امتوں کے منہ سے نکلی ہوئی اور خداوند تعالیٰ کی قبول کی ہوئی بھی قابلِ غور ہے جو یہ ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ

"اور بہت سے پیغمبر ہو گذرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والے لوگ (دشمنوں سے) لڑے تو جو مصیبت ان کو اللہ کے رستے میں پہنچی اُس کی وجہ سے نہ تو انھوں نے بہت ہی ہاری اور نہ ہی بودا پن کیا۔ اور نہ (دشمنوں کے آگے) عاجزی (کا) اظہار کیا۔ اور اللہ (مصیبت میں) ثابت قدم رہنے والوں کو دوست

رکھتا ہے اور سوائے اس کے ان کے منہ سے ایک بات بھی تو نہیں
نکلی کہ لگے دعائیں مانگنے کہ اے پروردگار ہمارے گناہ معاف کر
اور ہمارے کاموں میں جو ہم سے زیادتیاں ہوگئی ہیں ان سے درگذر فرما
اور (دشمنوں کے مقابلہ میں) ہمارے پاؤں جمائے رکھ اور کافروں
کے گروہ پر ہم کو فتح دے۔ تو اللہ نے ان کو دنیا میں بدلہ دیا (سو دیا)
آخرت میں بھی اچھا بدلہ دیا اور اللہ خلوص دل سے کام کرنے والوں
کو دوست رکھتا ہے "

غور فرمائیے:

ان دونوں الہامی دعاؤں کو جن کی قبولیت کا وعدہ صریحاً اور ضمناً قرآن مجید میں ملتا ہے، چھوڑ کر سورہ فاتحہ کو جو آپ نے جزوِ صلوٰۃ قرار دیا کیا اس میں ترجیح مرجوع لازم نہیں آتی؟

نوٹ:

یہ تو ہم کہہ آئے ہیں کہ سورہ فاتحہ کا پڑھنا ہمارا مذہب ہے۔ مگر سوال آپ کے طرز استدلال پر ہے۔

باانصاف ناظرین سے ایک سوال:

حضرات! منکرین حدیث اپنے زورِ علمی سے استنباط کر کے سورۂ فاتحہ کو جزوِ صلوٰۃ بنا دیں تو کیا اس حال میں ان کے منہ سے یا قلم

سے یہ الفاظ کچھ موزونیت رکھتے ہیں کہ

"قرآن شریف احکام شرعیہ کے بیان کرنے میں مفصّل اور مشرح ہے"

پس جب تک آپ (مفتی صاحب گجراتی) کسی قرآنی دلیل سے یہ ثابت نہ کرلیں کہ سورہ فاتحہ کو ہماری پیش کردہ دعاؤں پر من کل الوجوہ ترجیح ہے۔ آپ کا دعویٰ (سورہ فاتحہ کا جزو صلوٰۃ ہونا) ثابت نہیں ہوسکتا۔ برخلاف اس کے ہم نے ثابت کردیا کہ ہماری پیش کردہ دعاؤں کو اس وجہ سے ترجیح ہے کہ اُن کی قبولیت کا وعدہ صراحتاً یا ضمناً پایا جاتا ہے، غور سے پڑھیے:

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ

نکتہ غامضہ:

اِسْتَعِيْنُوْا صیغہ امر ہے جس کے معنی ہیں "مدد چاہو"۔ اس کا مقتضا یہ ہے کہ بندگانِ خدا بھی خدا سے بصیغہ انشاء درخواست کریں اور نَسْتَعِيْنُ بصیغہ انشاء درخواست نہیں بلکہ بصیغہ حال اظہار حال ہے۔ برخلاف اس کے ہماری پیش کردہ دعاؤں میں درخواست بصیغہ انشاء ہے جو بالکل مطابق ہے حکم استعینوا کے۔ یہ ایک غامض وجہ ترجیح ہے جو علم بیان کے اصول پر مبنی ہے ممکن ہے

اس کے سمجھنے میں کسی صاحب کو تکلیف ہو کیوں؟

ع قدر زر زرگر بداند یا بداند جوہری

مختصر ترتیب:

قابل مضمون نگار گجراتی نے مختصر ترتیبِ نماز جو لکھی ہے وہ اُنھی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

"اس طرح صلوٰۃ میں حالتِ قیام میں قرآن مجید پڑھنے کی، ترتیب یہ ہے کہ پہلے سورہ فاتحہ پڑھے پھر قرآن مجید سے جتنا آسانی سے پڑھ سکے اتنا پڑھے اور پھر قرآن مجید کی آخری سورہ پڑھ دے۔ یہ ترتیب چونکہ قرآن مجید کے عین مطابق ہے اس لیے اس کے درست ہونے میں کسی طرح کلام نہیں"

پس اس ترتیب کا ثبوت بذمہ منکرین حدیث ہے۔ یعنی پہلے سورہ فاتحہ پڑھے۔ پڑھنے کا ثبوت، نیز تقدم کا ثبوت، پھر قرآن مجید سے آسان سورہ پڑھے۔ اس کا ثبوت۔ پھر آخری سورہ پڑھے۔ اس کا ثبوت پھر اس دعوے کا ثبوت کہ

"یہ ترتیب قرآن مجید کے عین مطابق ہے"

مشرح اور مفصل الفاظ قرآنی سے دینا آپ صاحبان کا فرض ہے۔

دوسری دلیل:

فاضل نامہ نگار نے ایک اور دلیل بھی سورہ فاتحہ کی تخصیص پہ پیش کی ہے، وہ یہ کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ

اس آیت میں ایک حصہ سبعاً (سات آیات) کا ہے، دوسرا القرآن العظیم ہے۔ سورہ فاتحہ کی چونکہ سات آیتیں ہیں اس لیے اسی کو نماز میں پڑھنا چاہیے (ص ۲۵)

جواب:

باانصاف ناظرین! غور کیجیے کیا اسی کا نام ہے "مفصّل اور مشرح" جس کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور خواہ مخواہ ہم کو اس دعوے کا مخالف بنایا جاتا ہے اگر اسی کا نام آپ لوگ تفصیل اور تشریح رکھتے ہیں جس کو ہم مجمل کہتے ہیں تو کوئی اختلاف نہیں لا مناقشۃ فی الاصطلاح خواہ مخواہ کی نزاع کیا اور جھگڑا کیا۔

؎ جنگ کردی آشتی کن زانکہ نزد عاقلاں
این مثل مشہور اوّل جنگ آخر آشتی

سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ کہنے سے کچھ ثابت ہوا تو فقط یہ ہوا کہ سورۂ فاتحہ خاص طور پہ قابلِ ذکر اور بابرکت سورہ ہے۔ لیکن یہ سوال کہ اس کا پڑھنا

جزوِ صلوٰۃ ہے امرِ دیگر ہے جو دلیل کا محتاج ہے۔

نوٹ : سورہ کافرون بھی مع بسم اللہ کے سات آیات ہیں۔

تعوذ کا ثبوت:

گذشتہ اقتباس مندرجہ "اہلحدیث" میں جو قرآن مجید کی آخری سورہ پڑھنے کا مشورہ درج ہے اُس کی بھی عجیب کیفیت قابلِ دید و شنید ہے :

قابلِ مضمون نگار نے بتایا ہے کہ قیامِ نماز میں سورہ فاتحہ اور کوئی اور آسان سی سورہ پڑھ کر بطور تعوذ (اعوذ پڑھنے) کے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاس پڑھے کیونکہ یہ بھی قرآن میں حکم ہے کہ جب قرآن پڑھ چکو تو شیطان سے پناہ مانگا کرو۔ چنانچہ فاضل مضمون نگار کے الفاظ یہ ہیں :

"جب سورہ فاتحہ اور قرآن مجید پڑھا جا چکے تو شیطان سے اللہ تعالیٰ کی طرف پناہ مانگنا ضروری ہے جیسا کہ آیت ذیل سے ظاہر ہے

فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (۱۶ : ۱۰)

پس جب تو قرآن پڑھ چکے تو شیطان مردود سے اللہ کی طرف

پناہ پکڑ۔

چونکہ صلوٰۃ کا مقصد قرآن مجید ہے اور صلوٰۃ میں اور کچھ پڑھنا جائز نہیں اس لیے اعوذ بھی قرآن مجید سے ہی پڑھنا لازمی ہے چنانچہ اسی غرض سے قرآن مجید کے اخیر میں اعوذ کی سورہ درج ہے جو کہ درج ذیل ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ۝

اے نبی کہہ میں شیطان کے وسوسوں کی برائی سے خواہ یہ شیطان انسانوں میں سے ہو یا جنوں میں سے جس کا کام لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالنا ہے۔ نوع انسانی کے پروردگار بادشاہ اور معبود کی طرف پناہ پکڑتا ہوں"

(بلاغ بابت جنوری ص ۲۶)

اہلحدیث:

امر واقع کے طور پر یہ بتایا جاتا ہے کہ اذا قرأت القرآن کے معنی ہیں اذا اردت القرأتہ یعنی جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو شیطان سے پناہ لے لیا کرو۔ اس کی مثال دوسری آیت ہے:

اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ

(یعنی) "نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو وضو کر لیا کرو"

مگر ہمیں اس سے کوئی خاص غرض نہیں بلکہ غرض یہ ہے کہ آپ نے بھی اس میں وہی غلطی کی ہے جو عام لوگ کیا کرتے ہیں۔ عام اَن پڑھ لوگ جب کسی کی موت سنتے ہیں تو بے ساختہ اُن کے منہ سے یہ نکلتا ہے:

قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

اسی طرح بعض بے علم امامان مساجد بعد سلام نماز کہا کرتے ہیں:

قُلْ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ

جیسا پہلی مثال میں قالوا اور دوسری میں قل بے محل ہے اسی طرح ہمارے مخاطب کے تعوذ میں بھی قل بے محل ہے کیونکہ آپ نے تعوذ کے لیے ساری سورہ قل سے اخیر تک اختیار کی ہے حالانکہ آپ کا مقصود صرف اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ سے شروع ہوتا ہے۔

لہ قالوا کے معنی ہیں "انھوں نے کہا" اور قل کے معنی ہیں "تو کہہ" اس لیے پہلی مثال میں قالوا اور دوسری میں قل نہیں کہنا چاہیے

(اہلحدیث)

لطیفہ :

ہندوستانی علماء اور طلباء میں یہ اصطلاح ہے جس کو بے علم کہنا ہوتا ہے۔ کہا کرتے ہیں :

فلاں شخص "قل اعوذ یا" ہے۔

(اس کی وجہ شاید یہی ہو) کہ قل اعوذ میں بے علموں کو دھوکہ لگ جاتا ہے۔ واللہ اعلم

ابھی چند سوال باقی ہیں :

نماز شروع کیوں کر کرے۔ رکوع، سجود کو جاتے ہوئے کیا کہے رکوع سجود میں کیا پڑھے ختم نماز کس طرح کرے۔ یہ سب سوال ہنوز حل طلب ہیں :

؎ گفتگو آئین درویشی نہ بود!
ورنہ باتو ماجراہا داشتیم

مفتی صاحب سے ایک سوال :

ختم کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ فاضل مضمون نگار مفتی محمد الدین صاحب گجراتی سے ایک دردمندانہ سوال کریں۔

جناب! آپ نے بڑی محنت سے ترتیب صلوٰۃ قرآن مجید سے بتائی جو قریب قریب حدیثی صلوٰۃ کے مشابہ ہے۔ ایک شخص آپ

کے فہم کو نہ مان کر خود مبلغ قرآن اول مخاطب رحمٰن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم پر عمل کرے اور یہ سمجھے کہ اُن کا فہم قرآن آپ کے فہم سے یقیناً بالاتر اور مقدم ہے بلکہ یہ بھی یقین رکھے کہ جیسے الفاظ قرآن اُن کو سکھائے گئے تھے تفہیم معانی و مطالب بھی خدا کی طرف سے حضورؐ کو کی گئی تھی۔ دوسرا وہ شخص جو آپ کی تحریرات میں آپ کا فہم اور استنباط صحیح جان کر عمل کرے ان دونوں میں سے عند اللہ محفوظ کون ہوگا؟ ؎

میرے دل کو دیکھ کر میری وفا کو دیکھ کر
بندہ پرور منصفی کر نا خدا کو دیکھ کر
ہم سے پوچھیے تو ہمارا جواب دو حرفہ ہے ع
عالم بمنت یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف

مقام حیرت ہے:

اڈیٹر صاحب بلاغ کو ہمارے سوال پر حیرت ہے کہ ہم اُن سے کیوں یہ سوال کرتے ہیں کہ نماز کے مفصل اور مشرح احکام قرآن مجید میں دکھائیں چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ آپ (اہلحدیث) وہ سب احکام تو بجا لاتے ہیں جن کی بابت آپ کو شکوک نہیں

پھر یا تو مولانا صاحب کو ان احکام کی پابندی ترک کر دینی چاہیے اور یا مان لینا چاہیے کہ خدائے قدوس نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے صحیح اور درست ہے ہم ان احکام کی تعمیل احکام الٰہی مانتے ہیں اور بہمہ وجوہ مکمل جانتے ہوئے کرتے ہیں" (بلاغ ص۲۸)

اہلحدیث:

ہمیں حیرت ہی نہیں افسوس بھی ہے کہ آپ کو ہمارا مذہب سمجھنے میں تکلیف ہوئی اس سے معلوم ہو گیا کہ آپ اسی لیے ہمارے مذہب سے منکر ہیں۔ سچ ہے۔

من جهل شيئا عاداه

یقین ہے جس وقت آپ کو ہمارا مذہب سمجھ میں آ گیا اسی وقت آپ مخالفت چھوڑ کر تسلیم کر لیں گے یہ بیماری وجہ عدم فہم ہی کی ہے۔

پس سنیے! ہم بھی نماز روزہ کی تعمیل احکام الٰہی جان کر کرتے ہیں اس میں ذرا بھی تردد نہ کیجیے مگر اس طرح کہ قرآن مجید میں مجمل طور پر حکم دے کر خدا نے اس حکم کی تشریح اسوہ حسنہ (نبی) کے سپرد کر دی اور فرما دیا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

"ہمارا رسول تم مسلمانوں کے لیے نیک نمونہ ہے"
پس اس نمونہ کو دیکھو اور شرعی عمل بجالاؤ چنانچہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے:

صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ

"تم اُسی طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھ رہے ہو"
یہی معنی ہیں فرمان خداوندی کے۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ

اے نبی آپ اللہ کے بندوں کو اطلاع کر دیجیے کہ اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو خدا تم سب سے محبت کرے گا

چونکہ آپ لوگ اس "اسوہ حسنہ" کی تفہیم کو حجت شرعی نہیں جانتے اس لیے آپ سے سوال ہوا کہ آپ بقول خود
"مفصل اور مشرح احکام"
قرآن مجید میں دکھائیں۔ کیوں؟ ؎

نگفتہ ندارد کسے با تو کار!
ولیکن چو گفتی دلیلش بیار

مقامِ افسوس:

مقامِ افسوس ہے کہ اڈیٹر صاحب بلاغ لکھتے ہوئے بھول گئے کہ وہ خطاب کس سے کر رہے ہیں۔ آخر انھوں نے وہی طریقہ اختیار کیا جو عموماً آج کل مذہبی مکالمات میں کیا جاتا ہے کہ اپنے حلقۂ اثر میں مخاطب کی نسبت بدگمانی پیدا کی جائے۔ ہمارا خیال تھا کہ جماعت قرآنیہ میں گو کیسی ہی غلطیاں ہوں مگر وہ اس سخت ترین عیب سے پاک ہوگی لیکن افسوس۔

ع خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

قابل اڈیٹر "بلاغ" لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کے متعلق ہمارا صحیح اور پختہ اعتقاد ہے کہ ہمیں اس کے احکام مکمل ملتے ہیں کیوں ملتے ہیں؟ اس لیے کہ اس مقدس کتاب کی تلاوت ہم روایات ما و شما سے خالی الذہن ہو کر کرتے ہیں یہ نہیں کہ پہلے ہی سے حضرت داود علیہ السلام کی ۹۹ بیبیاں تسلیم کر لیں اور ایک نامحرم عورت کا ان کو عاشق کر لیا جائے وغیرہ" (ص ۴)

اہلحدیث:

اُف رے ظلم! مخاطب کے مذہب اور خیال سے کس قدر بیخبری

ہے۔ حالانکہ اڈیٹر صاحب کو میری دونوں تفسیروں کا علم ہے خاص کر عربی تفسیر کا ذکر آپ ص۵ پر خود کرتے ہیں مگر دیکھتے نہیں کہ اُس تفسیر میں اس قصہ کی تردید کیسے سنگین لفظوں میں کی گئی ہے۔ اگر فرمائیں کہ اس کلام کا روئے سخن آپ سے نہیں بلکہ اُن لوگوں سے ہے جو اس قصہ کو صحیح جانتے ہیں تو گزارش ہوگی کہ میرے جواب میں اس کو کیوں ذکر کیا؟ سائل تو میں تھا میرے جواب میں وہی کہنا چاہیے تھا جس کا میں قائل ہوتا۔ ایسا کبھی ہوا کہ مسلمانوں سے گفتگو کرتے ہوئے، عیسائیوں کے مسلّمات کا ذکر خواہ مخواہ بیچ میں لایا جائے۔ آہ! افسوس ؎

ہوا تھا کبھی سر قلم قاصدوں کا؟
یہ تیرے زمانہ میں دستور نکلا

۱۰

قرآنی نماز بتشریح حدیث[1]

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں نماز کا حکم بڑی تاکید سے

---

[1] ۶ مارچ ۱۹۲۵ء یوم جمعۃ المبارک اہلحدیث

آیا ہے جس کی صورت یہ بتائی ہے۔

۱۔ قیام کرو۔
۲۔ رکوع کرو
۳۔ سجود کرو۔

ان ارکان میں تو فریقین (اہلحدیث اور منکرین حدیث) متفق ہیں۔ اب صرف ایک رکن باقی ہے جس کو قعدہ کہتے ہیں جس میں التحیات پڑھکر سلام دیا جاتا ہے۔ یہ ایک فعل ایسا ہے کہ قرآن مجید میں اس کا صریح ذکر نہیں۔ ہاں قرآنی اسوہ حسنہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی تعلیم دی ہے۔

قیام، رکوع اور سجود کا ثبوت تو قرآن مجید کے صاف الفاظ میں ملتا ہے۔

قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ وَارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا

اذکار:

ان ارکان میں کیا پڑھنا چاہیے؟

قیام میں سورہ فاتحہ (ضروری) رکوع میں سبحان ربی العظیم سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ

قرآن مجید کے ارشاد فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کی تشریح

میں (اسوہ حسنہ علیہ السلام نے) فرمایا ہے:

لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب

"سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی"

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

فسبح باسم ربك العظیم

حدیث میں اسوہ حسنہ علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

"اجعلوھا فی الرکوع

اس حکم پر رکوع میں عمل کرو

یعنی رکوع میں سبحان ربی العظیم پڑھا کرو

قرآن مجید میں ہے:

سبح اسم ربك الاعلی

حدیث شریف میں ہے

اجعلوھا فی السجود

یعنی اس حکم کو سجدے میں عمل کرو

اسی طرح قعدہ میں پڑھنے کے لائق دعائیں بھی حضور مبلغ و مفسر اور مشرح قرآن (اسوہ حسنہ علیہ السلام) نے سکھائی ہیں جو آج کل کے علماء اہل قرآن کے سکھانے سے بدرجہا بلکہ من کل الوجوہ،

افضل ہیں اور افضل ہونی چاہئیں۔

اوقات نماز:

گذشتہ نمبروں میں ذکر آچکا ہے کہ منکرین حدیث میں سے گوجرانوالی جماعت تین نمازیں کہتی ہے۔ اس مسئلہ میں اُن کا باہمی جھگڑا اور مناظرہ بھی ہوا ہے اور ایک دوسرے کا رد بھی کرتے ہیں۔ ہم پر تو اس کا کوئی اثر نہیں کیونکہ ہمارے ہاں دلیل شرعی صرف قرآن ہی نہیں بلکہ قرآن اور حدیث دونوں ہیں اس لیے اگر کوئی مسئلہ قرآن مجید میں نہ ہو اور حدیث میں ہو تو اُس پر عمل کرنے میں ہم پر کوئی اعتراض یا سوال نہیں ہو سکتا۔ تاہم چونکہ اوقاتِ نماز کا ذکر قرآن مجید کے صاف لفظوں میں ملتا ہے اس لیے اُن کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔

اقم الصلوٰۃ طرفی النھار وزلفا من اللیل

دن کی دونوں طرفوں میں نماز پڑھا کرو اور کچھ تھوڑی رات گئے

دن کی دونوں طرفیں صبح و شام کی نماز اور کچھ رات گئے سے عشاء کی نماز مراد ہے۔ اس کی تائید میں یہ آیات بھی پیش ہو سکتی ہیں۔

۱۔ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا

۲۔ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ

پہلی آیت مندرجہ بالا سے اہل قرآن بھی نماز فجر مراد لیتے ہیں (رسالہ

اقیموا الصلوٰۃ صہ؟) (گو ہم اس کو یقینی نہیں جانتے) اور صلوٰۃ العشاء
سے تو صاف نماز ہی مراد ہے۔

نماز ظہر کی بابت ارشاد ہے:

اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس

"سورج کے ڈھلتے وقت نماز پڑھا کرو"

چار نمازیں تو یہ ہوئیں۔

کون نہیں جانتا کہ احکام شرعیہ مسلمان پر ہوش حواس اور بیداری کی حالت میں عائد ہوتے ہیں بے ہوشی اور نیند میں تو نہ وہ مخاطب ہوتا ہے نہ ادا کر سکتا ہے اس اصول کے ماتحت ہم دیکھتے ہیں تو نماز کا حکم مسلمان کو طلوع صبح سے شروع ہوتا ہے کیونکہ رات کو خدا تعالیٰ نے انسانوں بلکہ جملہ حیوانوں کے آرام کے لیے بنایا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیْکُمُ النَّھَارَ سَرْمَدًا
اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ مَنْ اِلٰہٌ غَیْرُ اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِلَیْلٍ
تَسْکُنُوْنَ فِیْہِ (پ ۲۰ ع ۱۰)

اگر خدا تم پر دن لمبا کر دے قیامت تک تو کون معبود ہے جو تمہارے لیے رات پیدا کر دے جس میں تم آرام پاؤ۔

چنانچہ اس آیت کے ماتحت ہر جاندار رات کو صبح تک آرام کرتا ہے۔

پس سب سے اوّل ہوش میں جو نماز ادا ہو سکتی ہے وہ صبح کی ہے۔ اُس کے بعد زوال شمس کے وقت مغرب اور عشا کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ لا محالہ وہ نماز جس کو قرآن مجید میں صلوٰۃ وسطیٰ کہہ کر حکم فرمایا ہے۔ وہ ان چاروں کے بیچ میں ہوگی جس کا نام عصر ہے قرآنی جامع حکم ملاحظہ ہو:

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى

(پ ۲ ع ۱۵)

(یعنی، سب نمازوں کی حفاظت کرو خاص کر درمیانی نماز کی بہت ضرور۔

ہماری تقریر متعلق صلوٰۃ وسطیٰ کو ملحوظ رکھ کر اہلِ قرآن کی تقریر بھی قابلِ غور ہے۔ لکھتے ہیں۔

"اللہ علیم حکیم نے حافظوا علی الصلوات میں عموماً تمام نمازوں پر نگہبانی کرنے کا حکم دیا ہے اور نماز وسطیٰ پر خصوصاً کیونکہ عطف خصوص پر عموم ہے اس حکم سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں جس نماز کے ساتھ کوئی خصوصیت

لگی ہوئی ہے وہی صلوٰۃ وسطیٰ ہے۔ قرآن مجید میں نماز فجر کے ساتھ ہی مشہوداً کی خصوصیت مذکور ہے۔ دیکھو:

ان قرآن الفجر کان مشہوداً

(پ ۱۵ : ۹)

لہٰذا نماز فجر ہی وسطیٰ ہو سکتی ہے"

(رسالہ اقیموا الصلوٰۃ ص۳)

اہلحدیث:

اہل قرآن ہم سے تو ہر حکم پر نص قطعی مانگتے ہیں۔ مگر وہ اپنے معتقدات اور مسائل پر نص کیا اشارۃً بلکہ دلالت وغیرہ بھی پیش نہیں کرتے "قرآن الفجر" سے صلوٰۃ فجر مراد لینا کس دلیل سے واجب القبول ہے ساری آیت یوں ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا"

(پ ۱۵ : ۹)

اس آیت میں زوال شمس کے وقت نماز ظہر پڑھنے کا حکم ہے اور صبح کے وقت قرآن پڑھنے کا اور بس۔

اہل قرآن!

قرآن الفجر کی تفسیر جو ہم نے کی ہے اس کی تائید دوسری آیت میں صاف ملتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتَابِ

(پ ۲۱ : ۱)

جو تمہاری طرف کتاب بذریعہ وحی بھیجی گئی ہے اس کو پڑھا کرو

یہی مضمون اس آیت (قرآن الفجر) کا ہے۔ قرآن الفجر سے جب صلوٰۃ فجر مراد لینا ہی واجب القبول نہیں تو خصوصیات خود بخود سب مرتفع ہو گئیں۔

علاوہ اس کے اگر نماز فجر صلوٰۃ وسطیٰ ہو تو پہلی نماز مغرب دوسری عشا ہوگی۔ تیسری فجر، چوتھی ظہر اور پانچویں عصر ہوگی۔ باوجود غیر موزوں ترتیب کے ہمارا مدعا ثابت ہوگا کہ نمازیں پانچ ہیں۔ الحمد للہ۔

منکرین حدیث اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حدیث کی وجہ سے مسلمان مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں ان کی اپنی حالت ملاحظہ ہو۔

جب کہ اُن کی پیدائش کو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔

۱۱

اہلِ قرآن کی نمازیں

(۱)

اُن میں باہمی اختلاف[1]

قاعدے کی بات ہے جب آدمی دو دونے چار کہنا چھوڑ دے تو پھر دو دونے پانچ کہے، سات کہے، نو کہے، سب کہہ سکتا ہے۔ اسی طرح اہلِ قرآن (منکرین حجیّت حدیث) نے عملِ نبوی کو چھوڑا تو اب جو اُن کی مرضی میں آتا ہے کیے جاتے ہیں۔ مولوی عبد اللہ چکڑالوی نے نمازیں بہت کچھ ترمیم کی۔ تعدادِ رکعات بدلی۔ دعائیں بدلیں، طریق خواندگی بدلا، مگر اوقات نماز برابر پانچ ہی رکھے۔ چنانچہ اُن کی کتاب "صلوٰۃ القرآن" دیکھنے سے یہ امر صاف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ ان کا زمانہ ابتدائی تھا اس لیے اُن کے بعد ترقی ہونی شروع ہوئی تو گوجرانوالہ اہلقرآن نے اوقاتِ نمازیں بھی ترمیم کی یعنی بجائے پانچ کے کل تین

[1] اہلحدیث ۲۲ر مارچ ۲۹ء

رکھیں ملاحظہ ہو ان کی کتاب اقیموا الصلوٰۃ اس کے بعد امرتسری اہل قرآن (بلاغ پارٹی) نے اور ترقی کی اس نے آٹھ پہر دن میں فرضوں کی کل دو نمازیں قرآن سے ثابت کیں چنانچہ بلاغ بابت فروری میں اس کو مفصل لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"آیاتِ قرآنیہ میں نماز کے تین وقتوں کا ذکر ہے۔ ایک رات کی نماز اور دو نمازیں دن کے دونوں طرف یعنی دن نکلنے سے پہلے اور سورج کے غروب ہونے کے پہلے لیکن آیت "نافلۃ لک" میں رات کی نماز کو نافلہ فرمایا ہے۔ اس لیے باقی دو وقت رہے ..... ہمارے رسول اکرم کو بھی دو ہی نمازوں کا حکم دیا گیا ہے"۔ (بابت فروری صفحہ ۲۶)

اس کے علاوہ ابھی ان میں اور بھی اختلاف پیدا ہوئے ہیں۔ ایک جماعت ہر رکعت میں ایک رکوع اور دو سجدے کرتی ہے تو دوسری ایک رکعت میں ایک ہی سجدہ کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک جماعت نماز میں رکوع کرتی ہے تو ایک ایسی بھی بن گئی ہے جو رکوع نہیں کرتی۔ ایک جماعت ایسی بھی پیدا ہو گئی ہے جو نماز کی حقیقت صرف ذکر الٰہی کو جانتی ہے۔ رکوع سجود نماز کی حقیقت

میں داخل نہیں جانتی۔ اسی طرح اوراد نماز میں بھی اختلاف ہے۔

اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے مسلک کے مطابق قرآن مجید سے صراحتاً یا اشارتاً پانچ نمازوں کا مجمل ثبوت دیں اور عملی تفصیل کو اسوہ حسنہ (سنت نبویہ) پر حوالہ کریں۔

۱۔ اقم الصلوٰۃ طرفی النہار

۲۔ من بعد صلوٰۃ العشاء

۳۔ اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس

۴۔ من قبل صلوٰۃ الفجر

ترجمہ:

۱۔ دن کی دونوں طرف نماز پڑھا کرو۔

۲۔ تمہارے غلام عشاء کی نماز کے بعد اذن لے کر تمہارے گھر میں آیا کریں۔

۳۔ سورج ڈھلنے کے وقت نماز پڑھا کرو

۴۔ فجر کی نماز سے پہلے۔

ان آیات میں چار نمازوں کا صاف نام کے ساتھ ذکر ہے صلوٰۃ الفجر، صلوٰۃ ظہر (لدلوک الشمس) صلوٰۃ مغرب دن کی دوسری طرف صلوٰۃ العشاء اب غور طلب بات یہ ہے

کہ چار کے عدد میں درمیان نہیں ہوتا۔ اس لیے آیت
حَافِظُوْا عَلَى الصَّلٰوٰتِ وَالصَّلٰوٰةِ الْوُسْطٰى
(سب نمازوں پر حفاظت کرو خاص کر درمیانی پر)
میں درمیانی نماز کا ذکر ثابت ہوتا ہے کہ کل نمازیں پانچ ہیں۔ صبح
ظہر عصر (درمیانی) مغرب اور عشاء
کیسی صاف تعلیم ہے مگر ناظرین حیران ہوں گے کہ جماعت
اہلقرآن جس کا اصل مقصود قرآن کی تبلیغ ہے وہ پانچ کی
بجائے تین اور دو کہتی ہے تو اُس کے حق میں یہ کہنا بجا ہوگا۔

گر تو قرآن بدیں نمط خوانی!
ببری رونق مسلمانی!

اس ساری بحث کا لب لباب ملاحظہ ہو۔

۱۲
منکرین حدیث اور اہلحدیث[1]
کی نزاع میں تنقیح

ہمارے ناظرین جانتے ہیں کہ عرصہ چند سال سے ایک

[1] اہلحدیث ۲۱ر نومبر ۲۴ء

گروہ منکر حدیث (اہل القرآن) پیدا ہوا ہے جملہ فرقہائے اسلام جو علاوہ قرآن کے حدیث نبوی کو بھی حجت جانتے ہیں اس فرقہ کو اختلاف ہے۔ اہل حدیث گروہ سے تو خاص کھٹکا ہے کیونکہ شروع سے اہل حدیث ہی ان کے جواب میں کھڑے ہوئے خاص کر اخبار اہل حدیث کا تو دعویٰ ہے سہ

بلائیں زلف جاناں کی اگر لیں گے تو ہم لیں گے

چونکہ اس فرقہ سے جملہ اہل اسلام کا اصولی اختلاف ہے اس لیے ہم نے اُن کی نزاع کی مختصر تنقیح قائم کر کے اس فرقہ سے سوال کیا تھا جس کا جواب لاہوری جماعت کے آرگن رسالہ "اشاعت القرآن" میں نکلا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اپنا تنقیحی سوال اور اُس کا جواب سارے کا سارا نقل کر دیں تاکہ بالانصاف ناظرین اندازہ لگا سکیں کہ جواب کہاں تک صحیح ہے بکم ذی الحجہ ۴ جولائی ۱۹۲۴ء کے "اہل حدیث" میں تنقیحی مضمون نکلا تھا جو بعینہ نقل ہے۔

اہلحدیث اور منکرین حدیث میں گو بہت سے مسائل میں اختلاف ہے مگر ان اختلافات پر نظر ڈال کر دیکھیں تو ان کی ایک ہی بنا ملتی ہے جو درحقیقت ان سب اختلافات کی جڑ ہے جس کو قانونی اصطلاح میں

"تنقیح" کہتے ہیں اس تنقیح کا فیصلہ جس فریق کے حق میں ہو جائے وہی حق پر ہوگا۔ اور عدالتی بلکہ شرعی طریق بھی یہی ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ کے بیان سے جو امر متنازع ثابت ہو جائے وہ "تنقیح" ہوتا ہے۔ اہل قرآن (منکرین حدیث) کا بیان ہم انہی کے لفظوں میں پیش کرتے ہیں۔

"بلاغ کی اشاعت سے ہمارا مقصد وحید یہ ثابت کرنا ہے کہ خدا کی مقدس کتاب قرآن مجید کے ہوتے ہوئے امت مسلمہ کو کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں کیونکہ نہ تو خدائے قدوس نے ہی اور نہ ہی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کو کسی اور کتاب کو دستور العمل بنانے کے لیے مکلف فرمایا۔

صرف قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے کہ جو شخص بھی اس کو اپنا ہادی اور راہبر یقین کرتا ہے اُس کے جملہ اغراض اصولاً پورا کرنے کے لیے یہ کتاب مقدس بہمہ وجوہ کافی ہے

عقل سلیم تو کبھی بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ کسی سوسائٹی کے لیے ایک ہدایت نامہ مرتب کیا جائے

اور پھر اس ہدایت نامہ سے متعلقین کو سخت پابند بھی کیا جائے
کہ اسی ہدایت نامہ کو بغور پڑھنا اور حسب التحریر اس پر عمل
کرنا لیکن وہ ہدایت نامہ مجمل رکھا جائے اندریں حالت
کہ اس ہدایت نامہ کے مصنف کو حکیم و علیم بھی مانا جائے
ہمارے خیال میں ایسے ہدایت نامہ کو مجمل کہنا سراسر دھوکا
دینا ہے یا اپنی غلطی کیونکہ ایسی بات یا معانی اس ہدایت
نامہ کے مطالعہ سے ہرگز ہرگز نہیں پائے جاتے جس سے
ثابت ہو کہ مجمل یا نامکمل ہے چنانچہ اس مقدس ہدایت نامہ
میں اس کی تفصیل اور صراحت کے متعلق جو کچھ مرقوم
ہے وہ حسب ذیل ہے۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى
وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (پ ۸ : ۱۳)

اور ہم نے تو ان کو قرآن پہنچا دیا سمجھ بوجھ کر اس میں ہر طرح کی
تفصیل بھی کر دی - ایمان والے لوگوں کے حق میں ہدایت
اور رحمت ہے۔

الٓرٰ: كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ
حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (پ ۱۱ : ۱۷)

"الر، یہ ایسی کتاب ہے (جو) حکمت والے باخبر خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے، اس کے مضامین مستحکم اور پھر خوب تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں"۔

مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ
بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى
وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (پ ۱۳ : ۶)

"بلکہ جو (آسمانی کتابیں اس (کے نزول) سے پہلے (موجود) ہیں ان کی تصدیق کرتا ہے اور اس میں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان والے ہیں ہر چیز کا تفصیلی بیان اور ہدایت اور رحمت ہے"

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ
يَّعْلَمُوْنَ (پ ۲۴ : ۱۵)

"یہ کتاب ہے جس کی باتیں زبان عربی میں سمجھ دار لوگوں کے لیے تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں"

آیاتِ بالا کسی تفسیر یا وضاحت کی محتاج نہیں۔ بیان صاف سادہ اور ہر ایک عالم اور جاہل کی سمجھ کے موافق ہے کہ خدا کی کتاب میں جو اوامر و نواہی و دیگر ارشادیں خوب

تفصیل اور نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور کہ یہ کتاب ہدایت اور رحمت بھی ہے"!

("بلاغ" ۵ ص ۳۳، ۳۴)

اہل حدیث کا جواب دعویٰ :

ہم منکرین حدیث کے اس بیان کو کہ

"اوامر و نواہی (یعنی احکام شرعیہ) خوب تفصیل اور نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں"

محتاج ثبوت جانتے ہیں۔ اس لیے جب تک وہ احکام شرعیہ کو انہی لفظوں میں (مفصل اور مشرح قرآن میں) ثابت نہ کریں اُن کا دعویٰ ناقابل قبول ہو گا پس اُن کا فرض ہے کہ پہلے احکام شرعیہ کی فہرست بنا دیں پھر اُن کی تفصیل اور تشریح سنائیں۔ اپنی فہرست احکام ہم پیش کرتے ہیں۔ منظور ہو تو نعم الاتفاق اس میں اختلاف ہو تو اظہار ضروری۔

مثلاً نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ۔ حج۔ خراج اراضی۔ اطاعت امیر۔ قوانین تعزیرات وغیرہ۔

سب سے مقدم نماز ہے۔ دیگر احکام بھی ضروری ہیں پس اسی ترتیب سے احکام شرعیہ کی تفصیل سنائیں ورنہ کہا جائیگا!

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۝

نگفتہ ندارد کسے با تو کار!
ولیکن چو گفتی دلیلش بیار

اہلحدیث:

مناسب بلکہ ضروری تھا کہ اس کے جواب میں سب سے پہلے امرتسری رسالہ "بلاغ" پیش ہوتا جو مخاطب اول تھا۔ خدا جانے کیوں خاموش رہا۔ اس کی وجہ وہی جانے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں ؎

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

بجائے "بلاغ" کے لاہوری "اشاعت القرآن" بولا اور خوب بولا۔ اچھا بولا، چنانچہ اُس کے الفاظ یہ ہیں:

"ناظرین! فقیر نے اپنے رسالہ اشاعت القرآن بابت ماہ اپریل کے صہ میں لکھا تھا کہ اگر اسلامی فرقوں کے علماء اور مشائخ صاحبان کے خیال میں قرآن مبین مجمل اور متشابہ اور صامت یعنی گونگا ہے تو قرآن مجید کی کوئی ایک آیت ہی ایسی پیش کرو کہ جس کی حسب وعدہ احسن تفسیرا اللہ نے تفسیر اور تشریح نہ کی ہو اور صحاح ستہ اور صحاح اربعہ اور کتب صوفیہ یا ائمہ مجتہدین یا مرزا قادیانی صاحب

نے اس کی تفسیر کر کے اس کے اجمال اور ابہام کو رفع کیا ہو۔ مگر آج تک علاروایتی مولوی ثناء اللہ امرتسری اور مرزا محمود قادیانی اور مولوی محمد علی صاحب اور خواجہ کمال الدین صاحب لاہوری اور دیوبندی علمائے احناف اور سید علی الحائری صاحب شیعی اور اڈیٹر اخبار القاسم وغیرہ نے کبھی قلم اُٹھانے کی جرأت نہیں کی کہ وہ ہمیں اس امر کا ثبوت دیں کہ فلاں آیت قرآن مبین کی مجمل اور صامت ہے۔ اور اس کی تفسیر کسی نے خارج از قرآن کر کے اس کے اجمال کو رفع کیا ہے "

(اشاعت القرآن ۱۵ر اگست

اھلحدیث: ص ۱۴)

"اشاعت القرآن" نے "اہلحدیث" کا مضمون خود نقل کیا ہے۔ نقل کر کے یہ جواب دینا اور مثال پوچھنا کس قدر حیرت انگیز ہے۔ کیا سچ ہے ؎

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور! کب تلک!

ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا ؟

ای جناب! انسان سب کو دھوکہ دے سکتا ہے۔ مگر خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ کیا آپ نے "اہلحدیث" کے مضمون

ہیں مجمل آیات کی مثالیں نہیں دیکھیں۔ اگر نہیں دیکھیں تو ہم آپ کو آپ کے اسی پرچہ (مورخہ ۵ اگست) صفحہ ۴ کی سطر چار پر توجہ دلاتے ہیں جہاں آپ نے ہمارا مضمون نقل کیا ہے چنانچہ وہ الفاظ یہ ہیں:

"مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، خراج۔ وغیرہ"

کیا آپ کا فرض نہ تھا کہ ان احکام کے متعلق جو آیات قرآن مجید میں ہیں ان کی تفصیل اور تشریح قرآن مجید سے دکھاتے؟ اگر تھا اور آپ نے یہ فرض ادا کیا تو ان کا حوالہ دیجیے اور اگر ادا نہیں کیا تو مہربانی کر کے اب کر دیجیے۔

ہاں ہم آپ کو اجازت دیتے ہیں کہ آپ اپنے دوسرے، گجرانوالی اور امرتسری بھائیوں کو بھی ملا کر صلاح مشورہ سے جواب دیجیے۔

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

ناظرین! جہاں جہاں آپ لوگوں کو اس فرقہ (منکر حدیث) سے ملاپ ہے۔ لاہور میں ہو یا چکڑالہ میں۔ پنجاب میں ہو یا بنگال میں سب جگہ ان سے اس مضمون کا جواب طلب کریں تاکہ متنازعہ تنقیح ایک طرف ثابت ہو۔

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

قارئین کرام منکرین حدیث کا آج بھی یہی دستور ہے کہ وہ اپنے ہر سوال کا جواب پا کر بھی سوال کو دھرلتے جائیں گے اور فیصلہ کن بحث سے قطع نظر کر کے نئے سوالات چھیڑ دیں گے ایک نمونہ مزید ملاحظہ ہو۔

۱۳

اہل قرآن کی حرکت مذبوحی[1]!

گر تو قرآں بریں نمط خوانی !
ببری رونق مسلمانی !

ہمارے ناظرین آگاہ ہوں گے کہ جماعت منکر حدیث (اہل قرآن) کا اصل مرکز پنجاب میں لاہور ہے جہاں مولوی عبداللہ چکڑالوی مو ضع چکڑالہ ضلع میانوالی (پنجاب) سے آکر چینیاں والی مسجد چینیانوالی میں مقیم ہوئے۔ وہاں میاں محمد چٹو وغیرہ ان کے معتقد بنے بعد ازاں میاں محمد چٹو نے ایک مکان اس فرقہ کی مسجد کے لیے دیا جہاں آج کل یہ لوگ نماز پڑھتے ہیں مولوی عبداللہ چکڑالوی کی وجہ سے اس فرقہ کا نام چکڑالوی مشہور ہوا۔ مولوی چکڑالوی کے مرنے کے بعد بقول ؎

---

[1] اہلحدیث ۲۷ر مارچ ۱۹۲۵ء۔

آپ کے سجادہ نشین قیس ہوا میرے بعد

مولوی حشمت علی پنجابی دہلی سے آکر لاہور میں مولوی چکڑالوی کے قائم مقام ہوئے لیکن انصاف یہ ہے کہ مولوی عبداللہ گو علوم اصول معقول نہیں جانتے تھے مگر علوم صرف و نحو میں پنجابیوں کی طرح اچھی دسترس رکھتے تھے۔ برخلاف اس کے مولوی حشمت علی خیر سے ہیں جن پر یہ شعر بالکل صادق آتا ہے ؎

اگرچہ شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

آپ کی قابلیت کا ثبوت آپ کی گذشتہ تحریروں سے قطع نظر جدید یہ ہے کہ آپ لکھتے ہیں کہ حافظ پیر جماعت علی شاہ علی پوری کے پاس گیا اور حجیت حدیث کے متعلق سوال کیا۔ پیر صاحب نے آیت

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى

پڑھی تو:

"فقیر (حشمت العلی) نے عرض کی کہ اچھا فرمائیے کہ ماینطق میں "ما" عام ہے یا خاص۔ آپ (پیر جی) نے فرمایا کہ ہاں یہ "ما" عام ہے"

(اشاعت القرآن دسمبر ص۹)

اظہار لیاقت:

مقصود مولوی حشمت اللہ علی کی شکایت نہیں بلکہ اظہار لیاقت ہے کہ آپ "ما" نافیہ کی بابت پوچھتے ہیں کہ عام ہے یا خاص جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس "ما" کو موصولہ اسمجھتے ہیں۔ کیوں نہ ہو۔ الحمد للہ میں واؤ عطف کا ہے۔

خیر یہ تو ایک تمہیدی بات تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے بارہا لکھا کہ اہلحدیث اور منکر حدیث میں تنقیح صرف یہ ہے کہ قرآنی

۱؎ منکرین حدیث کسی تنقیح کی جانب دھیان دینے کے حق میں نہیں ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ راقم کی کتاب "انکار حدیث کے چار نقیب"

احکام محض قرآن سے مشرح ملتے ہیں یا حدیث سے تشریح کی ضرورت ہے، منکرین حدیث مدعی ہیں کہ سب احکام قرآن سے مشرح ملتے ہیں۔ ہم نے اس دعوی کا ثبوت بارہا طلب کیا۔ ہم کو کہا گیا کہ کوئی حکم پیش کرو جو مفصل اور مشرح۔ . . . . . .

. . . . . نہ ہو۔

ہم نے اس مطالبہ میں سب سے پہلے نماز ہی کو پیش کیا۔ اور یہ بحث بصورت جریدہ ۲۳ ذی قعدہ مطابق ۲۷ جون ۱۹۲۴ء کے پرچہ سے چلی۔ اس کے بعد ہم نے بارہا یاد دہانی کی اور مثال میں سب سے مقدم نماز ہی کو پیش کیا۔ اس کے جواب میں جناب ملا قرآنی (منکر حدیث) مولوی حشمت علی جن کی قابلیت کا ذکر آپ اوپر پڑھ چکے ہیں ابڑی سج دھج سے فرماتے ہیں اور کیا ٹھیک فرماتے ہیں۔

"ملا روائتی (اڈیٹر اہلحدیث) صاحب! کیا یہ مغالطہ نہیں ہے کہ فقیر (حشمت علی) کا آپ سے سوال کیا تھا اور آپ نے اس کا جواب کیا دیا ہے کیا قرآن دانی اور منصف مزاجی اسی کا نام ہے کہ سوال تو زید سے ہو اور جواب میں بکر کو پیش کر دو اور کہہ دو کہ اسی کو مثلاً زید تصور کر لو۔ اجی حضرت! سوال تو صرف ایک آیت کا ہے کہ ایک آیت ایسی قرآن کی مجمل،

ثابت کرو کہ جس کی تفسیر قرآن مجید میں نہ ہو اور اس کے اجمال کو
کسی شخصیت نے رفع کیا ہو۔ آپ نے جو نماز، روزہ وغیرہ
کو مثالاً پیش کیا ہے۔ کیا فقیر نے آپ سے مجمل آیت طلب
کی تھی یا مثال۔ اپنی مصنوعی مثال کو مجمل آیت کہنا کس لغت
میں ہے۔ کیا آپ ایسے مسلوب العقل ہو کہ آپ سے سوال
تو آیت اور اس کے ابہام اور اجمال کے رفع کی نسبت ہے
اور جواب اس کی مثال سے دیتے ہو تو بتلاؤ کہ تم اللہ تعالیٰ اور
اس کی مخلوق کو دھوکہ دیتے ہو۔ یا فقیر دھوکہ دے رہا ہے۔
کچھ تو خشیۃ اللہ سے کام لو۔ ہم کو آپ کو بجا طور پر رب العالمین
آپ کی بہتری اور خیر خواہی کے لیے صرف صراط المستقیم جو
نہایت بے خطر اور سیدھا اور پختہ راستہ ہے اس پر چلنے
کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ مگر افسوس آپ صراط المستقیم پر
چلنے سے سخت گھبرائے اور اس سے تو کدم بھاگ رہے
ہیں اور اس محکم راستہ کو پر خطر ثابت کرنے کے لیے کوشاں
ہیں۔ اگر آپ ہم کو اپنا دشمن اور گمراہ کرنے والا یقین کر چکے
ہو تو یقین جانو تم سے بڑھ کر بدقسمت اور بے نصیب کون
ہوگا جو جان بوجھ کر اپنی ہلاکت اور گمراہی کے راستہ پر

چلنے کو آمادہ ہے۔ آپ کا فرض تو یہ تھا کہ اگر آپ کا ایمان آیت
اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ... الخ
اور دیگر آیات جن میں قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ یہ ناقص
اور مجمل اور ذی عوج نہیں ہوں۔ ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے
ایک آیت تحریر کرتے کہ یہ آیت مجمل اور مبہم ہے اور اس
کا مفہوم بیان کرنے میں تمام قرآن ساکت اور صامت
اور گونگا ہے اور اس کے اجمال اور ابہام کو بخاری یا کسی
اور شخصیت نے رفع کیا ہے۔ آپ نے نہ تو آیت لکھی اور
نہ اس کا کوئی اجمال اور ابہام ظاہر کیا اور نہ یہ بتلایا کہ اس آیت
کے اجمال اور ابہام کو قرآن مجید باوجود دعویٰ تفصیل و
احسن تفسیر اس کے رفع نہ کر سکا۔ لیکن بخاری صاحب یا کسی
اور شخصیت نے اس کو رفع کیا ہے۔ آپ نے مثالوں کو
کیوں پیش کیا فقیر کا سوال مثالوں کی نسبت نہیں تھا بلکہ
آیت کی نسبت ہے"

(اشاعت القرآن بابت ماہ دسمبر
سنہ ۱۹۲۴ء صہ ۱۲)

اہلحدیث: آغا! تلوار میان کن جنگی، تو آپ نے بہت اظہار فرمائی مگر

بات کا بلتہ انجر معلوم نہ ہوا کہ آخر یہ رنج کیا ہے اور ہماری مثال غلطی کیا۔ ہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہم شروع سے لکھتے آئے ہیں کہ

مدلیں یہی ہمارے اور منکرین حدیث میں سب سے پہلی فیصلہ کن بات ہے کہ منکرین حدیث کی جو پارٹی جیسی بھی نماز پڑھتی ہے اس کا ثبوت مفصل اور مشرح قرآن مجید سے دکھا دیں" ("اہلحدیث" ۲۳ ذیقعدہ مطابق ۲۷ جون ۱۹۲۴ء صہ کالم ۳)

ناظرین! ابتداہی سے جب نزاع یہی ہے۔ اب جو ہم نے مسئلہ نماز پیش کیا تو کیا جرم کیا لیکن ہمارے ملا منکر حدیث کے نزدیک بادنجان اور بینگن میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس لیے وہ ہم پر خفا ہو رہے ہیں کہ ہم نے بجائے آیت مجملہ کے مثال کیوں پیش کی۔ لہذا ہم جناب ممدوح کی تعمیل ارشاد کرتے ہیں کہ لیجیے حضرت آیت مجملہ یہ ہے:

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ

نماز قائم کرو

اس حکم کی تعمیل جیسی بھی آپ کرتے ہیں بعینہ قرآن مجید سے دکھا دیجیے کیونکہ ؎

روزِ محشر کہ جاں گداز بود!
اوّلیں پرسشِ نماز بود!

نیاز فتح پوری !

نگار کے اڈیٹر نیاز فتح پوری نے جب حدیث کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا تو اُن کے استدلال کی پشت پر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی ضخیم جلدیں بھی صف آرا تھیں۔ ان کی کتاب من ویزدال میں مذہبی استفسارات کے جوابات دیتے وقت یورپ کی یہ "الہامی" کتاب بڑی فراخ دلی کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ وہ بظاہر حدیث کے مخالف نظر آتے ہیں جیسا کہ انھوں نے بار بار ظاہر کیا ہے لیکن اس مخالفت کے پس پردہ فی الواقعہ دین اسلام سے بیزاری کا شدید جذبہ موجود ہے۔ جو انھیں بے چین کیے ہوئے ہے اور وہ دین کے جملہ مسلّمات کو یک قلم غیر ضروری، غیر اصلی، غیر حقیقی اور اسرائیلی روایات کی صدائے بازگشت قرار دیتے ہیں۔ ان سے پہلے کے منکرین حدیث کا خطاب زیادہ تر اپنے وقت کے علماء سے تھا جو ان کے ہر وار کا جواب برابر کے ہتھیار سے دیتے تھے اور اس طرح منکرین عالم اسلام میں جو انتشار پھیلانا چاہتے تھے۔ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر نیاز صاحب کا حلقۂ خطاب علماء سے بڑھ کر جدید تعلیم یافتہ حضرات تک پھیلا ہوا ہے۔ کالجوں کے طلبہ اور پروفیسر صاحبان خصوصیت کے ساتھ ان کے مخاطب ہیں۔ اس طرح اس زہر چکانی کے اثرات امت کے لیے زیادہ نقصان دہ ہیں اور ان دنوں لاہور کے رسالہ طلوع اسلام کو جو فروغ

مل رہا ہے۔ وہ نیاز صاحب کی ان مساعی کا ماحصل ہے جو حدیث کے خلاف ایک عرصے سے جاری ہیں بطلوع اسلام کو ایک حد تک اپنے خیالات کی تخم ریزی کے لیے زمین تیار ملی ہے۔ ان لیے اس کی آواز میں سابقہ منکرین حدیث سے کہیں بڑھ کر قدرت اور توانائی ہے تاہم ان کے پیشوایان طریقت نے حملہ کا جو طریقہ آج سے چالیس سال قبل اختیار کیا تھا وہ اسی پر سختی سے گامزن ہیں اور پوری پوری احتیاط اس امر کی جارہی ہے کہ کھل کر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہ کی جائے بلکہ ظاہری طور پر اپنے آپ کو حضور کا پیرو بتایا جائے اور پس پردہ حضور کے دین کی ایسی تشریح اور توضیح کی جائے کہ ابلیس بھی کان پکڑ لے۔ نیاز صاحب لکھتے ہیں:

"جس وقت آپ غور کریں گے کہ روایت حدیث کی ابتدا کب سے ہوئی تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ زمانہ وہ تھا جب رسول اللہ کی وفات کے بعد اسلام کا دائرۂ اثر وسیع ہوتا جارہا تھا اور اس کی سلطنت و حکومت پھیلتی جارہی تھی۔ مسیحی مذہب کے پیرو، دوسری مسالک کے متبعین، فلسفہ یونان کے ماننے والے، ایران کے آتش پرست اور بدھ مذہب کے تارک الدنیا لوگ، سبھی سے مسلمانوں کو واسطہ پڑ رہا تھا اور ان سب کے تمدن و اخلاق، مذہب و اعتقاد کے مقابلہ میں ان کو اسلام کا مطالعہ کرنا اور شریعت اسلامی کا منضبط کرنا ضروری تھا۔ . . . . "

"۲ ... ... رسول اللہ کی وفات کے بعد ہی روایت حدیث اور وضع حدیث کی بنیاد پڑ گئی تھی کیونکہ جب دو مخالف جماعتوں میں سے ہر ایک اپنی موافقت میں حدیث پیش کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک ضرور جھوٹی ہو گی۔ اگر دونوں نہ ہوں۔ پھر صحابہ کے بعد جب عہد بنی امیہ بنی عباس میں مصالح سیاسی کے لحاظ سے ہر ایک جماعت کو اپنی تائید میں بہت زیادہ ضرورت نقل احادیث کی پڑی تو اس وقت مستقل ٹکسالیں وضع حدیث کی قائم ہو گئیں اور حکومت کے اثر اور روپیہ کے زور سے جس امیر و خلیفہ نے جس قسم کی احادیث کی ضرورت ہوئی فوراً ڈھلوالیں چنانچہ کتب تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ خود امراء کے پاس جا جا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کسی حدیث کی ضرورت ہو تو ہم بنا کر دی جائے اس کے ساتھ چونکہ حدیث روایت کرنے والوں کی سوسائٹی میں بہت عزت کی جاتی تھی اس لیے لوگوں میں بالطبع یوں بھی اس طرف رغبت پیدا ہوئی۔ آپ صحیحین کو اٹھا کر دیکھیے جو سنیوں میں نہایت اہم کتابیں حدیث کی سمجھی جاتی ہیں آپ کو معلوم ہو گا کہ اہم ترین مسائل میں بھی باہمدگر متعارض و مخالف احادیث ان میں پائی جاتی ہیں چہ جائے کہ فروعی مسائل۔ کہ اگر ان میں کوئی شخص احادیث کی پابندی کرے تو ایک ہی وقت میں کافر و مسلمان دونوں بن سکتا ہے ... "

"۳ ... ... ان حالات کے تحت اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ

یا تو تمام کتب احادیث کو سامنے رکھ کر از سرِ نو جدید معیارِ تنقید کے لحاظ سے پوری طرح ریسرچ کیا جائے اور واقعی جو احادیث رسول کی ہوں انھیں متعین رکھ کر باقی کو نظر انداز کر دیا جائے اور اگر یہ ممکن نہیں ہے (اور یقیناً ممکن نہیں ہے کیونکہ ہمارے یہاں کے علماء کو نہ اس کا سلیقہ ہے نہ ضرورت) تو پھر محفوظ صورت یہ ہے کہ اسلام و اصول اسلام کا مطالعہ احادیث سے بالکل علٰحدہ ہو کر کیا جائے۔"

۴:"...... پھر چونکہ احادیث اسی قسم کی مخالف عقل باتوں سے بھری پڑی ہیں اس لیے اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں۔ یا تو انھیں رسول اللہ سے منسوب کر کے رسول اللہ کی توہین کیجیے یا احادیث سے قطع نظر کر کے منکر بخاری ہونے کا الزام گوارا فرمائیے۔ میں چونکہ رسول اللہ کی ذاتِ گرامی کو بخاری وغیرہ سے ارفع سمجھتا ہوں اس لیے ظاہر ہے کہ میں احادیث کا قائل کیوں کر ہو سکتا ہوں[۱]"

۵: "آپ کیا پوچھتے ہیں کہ ان جاہل مولویوں اور کم عقل واعظوں نے اسلام کو کس طرح بدنام کیا ہے اور ان کی گندہ تصانیف نے بانی اسلام پر کیا کیا تہمت تراشی ہے۔ ایک پل صراط پر کیا موقوف ہے۔ اور ہزاروں باتیں ایسی ہیں جن کا پتہ نہ کلام پاک میں ہے اور نہ تعلیمات اسلامی میں لیکن آج وہ مسلمانوں کے نہایت اہم عقائد میں شامل نظر آتی ہیں[۲]۔"

---

[۱] من ویزداں حصہ دوم ص ۳۵۰-۳۴۷ [۲] ایضاً ص ۳۶۲

ان اقتباسات کا ماحصل یہ ہے۔ کہ حضورؐ کی رحلت کے بعد دوسرے مذاہب سے واسطہ پڑنے پر روایت حدیث کی ابتداء ہوئی۔ صحابہ کے عہد میں ایک دوسرے کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے صحابہ نے جھوٹی حدیثیں وضع کیں۔ عہد بنی امیہ اور عہد بنی عباس میں تو اس کام کے لیے وسیع پیمانے پر ٹکسالیں بنائی گئیں۔ احادیث میں اہم ترین مسائل میں بھی اختلاف ہے۔ لہٰذا اگر کوئی بھی احادیث پر عمل کرے تو وہ بیک وقت کافر بھی ہو سکتا ہے اور مسلمان بھی۔

—— یہ اعتراضات نئے نہیں ہیں۔ منکرین حدیث ان پر ربع صدی سے عمل پیرا ہیں۔ بلاغ دسمبر ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر صادق علی کپورتھلوی نے لکھا ہے کہ:

"رسول کریمؐ کے بعد صحابہ اور تابعین کے زمانے نہایت تاریک تھے۔ ان میں نیک و بد کا امتیاز کرنا مشکل تھا۔ اسی لیے کوئی عالم صحابہ کے زمانہ کے منافقوں کی اور تابعین کے زمانہ کے منافقوں کی تعداد اور نام نہیں بتا سکا"! ص ۱۰

اس پر اہلحدیث نے بدیں الفاظ تنقید کی تھی:

"خدا کی شان حدیث سے انکار کر کے نوبت کہاں تک پہنچی ہے کہ صحابہؓ اور تابعینؒ کے زمانہ کو تاریک زمانہ کہنے لگ گئے۔ کیونکہ منافقوں کی تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔ کیا اس کا جواب یہ نہیں جو امام شافعیؒ عرصہ ہوا دے چکے کہ منافق زمانہ رسالت میں تھے۔ اس کے بعد اسلام ہے یا کھلا کفر"۔ ڈاکٹر صاحب نے کمال کیا اس غلط اصول پر یہ نتیجہ نکالا کہ اس لیے ایسی حدیثیں:

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم (الحدیث)
بالکل خلاف واقعہ ہونے کے سبب بالکل غلط ہیں۔ رسول کریم صلعم کا زمانہ بھی کفر وضلالت کی شب تاریک تھا لیکن اس میں قرآن نازل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح نمایاں ہوگئی۔" ص ۱۔

خدائی تصرف۔ حدیث مرقوم کو غلط قرار دے کر (جس میں زمانہ رسالت کو بھی خیر فرمایا ہے) اخیر میں ڈاکٹر صاحب خود ہی زمانۂ رسالت کو صبح نمایاں قرار دیتے ہیں پھر اس کے خیر ہونے میں کیا شک؟ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک صحیح حدیث وہ ہے جو قرآن شریف کے مطابق ہو۔ جیسے قرآن شریف میں ارشاد ہے:

محمدٌ رسول اللہ والذین معہٗ اشداء علی الکفار رحماءُ
بینہم تراہم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناً سیماہم
فی وجوہہم من اثر السجود (پ ۲۶ رکوع ۱۲)

یہ آیت آنحضرتؐ اور صحابہؓ کی کمال ایمانداری، پارسائی بتا رہی ہے۔ اسی آیت کی بنا پر حدیث مذکورہ میں اگر زمانہ صحابہؓ کو خیر کہا گیا تو حدیث غلط ہوئی یا اس آیت کی موافقت میں صحیح" ص ۲-۲۵ جنوری ۱۹۲۹ء۔

علامہ نیاز جی کے ان الزامات کے جوابات میں ہم اسی محولہ بالا آیت پر اکتفا کرتے ہیں اور ناظرین بانصاف پر یہ فیصلہ چھوڑتے ہیں کہ صحابہ کے عہد کو دروغ گوئی کا دور اوّل قرار دینا قرآن کے خلاف ہے یا موافق۔

علامہ جی کے ارشادات میں یہ فقرے قابلِ تعریف ہیں کہ بعض لوگ خود امراء کے پاس جاجا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کسی حدیث کی ضرورت ہو تو مہیا کر دی جائے بہت خوب! اس کے ساتھ چونکہ حدیث روایت کرنے والوں کی سوسائٹی میں بہت عزت کی جاتی تھی اس لیے لوگوں میں بالطبع یوں بھی اس طرف رغبت پیدا ہوئی "

بندہ پرور جو لوگ جھوٹی حدیثیں تیار کرنے پر اتنے آمادہ ہوں کہ امراء کے دروازوں پر جاجا کر فرمائش کا تقاضا کریں ان کے بارے میں یہ ارشاد کہ ان کی سوسائٹی میں بہت عزت کی جاتی تھی، درست نہیں ہو سکتا جھوٹ کا کاروبار کرنے والے کبھی کسی سوسائٹی میں بہت عزت کے مالک نہیں ہوا کرتے۔

یہ سارا زور بیان اس لیے ہے کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کو دین کے ان خدمت گاروں سے (جنہوں نے قصرِ سلطانی کے گنبدوں پر کبھی بسیرا نہیں کیا) بدظن کر دیا جائے۔ اور یوں ان کی مساعیِ جمیلہ سے روگردانی اتنی عام ہو جائے کہ ان صلحائے امت اور آئمہ شریعت کا نام سنتے ہی یورپ پسند دراہل نظر "الظلم کھلے بے زاری کا اظہار کرنے لگ پڑیں۔ اس کے بعد دین کا پوسٹ مارٹم جس طرح جی چاہے کر لیا کریں۔

نیاز صاحب نے جھوٹی حدیثوں کی تخلیق سے متعلق جس افسانہ تراشی سے کام لیا ہے۔ اس کی تردید کے لئے ہم علمائے حق کے سلسلۂ عالیہ میں سے صرف ایک خادمِ ملت کی زندگی کے چند واقعات بیان کرینگے

اس سے یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی کہ جن علمائے حق کے نام حدیث کی نسبت سے آج زندہ ہیں۔ وہ کس پایہ کے لوگ تھے اور ان کی افتاد طبع کیسی تھی، اور دین پر ان کی استقامت کا کیا حال تھا۔

تیسری صدی کا ابتدائی زمانہ تھا، فلسفہ کا طوطی بول رہا تھا۔ ہر مسئلہ کے لئے فلسفہ کے دربار سے سند لی جاتی تھی بقول مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) "یہ وقت تھا کہ قیام سنّت و دین خالص کا قیامت تک کے لئے فیصلہ ہونے والا تھا۔ اور مامون و معتصم کے جبر و قہر اور بشیر مریسی اور قاضی ابن ابی داؤد جیسے جبابرہ معتزلہ کے تسلّط و حکومت نے علماء حق کے لئے صرف دو ہی راستے باز رکھے تھے۔ یا اصحاب بدعت کے آگے سر جھکا دیں اور مسئلہ خلق قرآن پر ایمان لاکر ہمیشہ کے لئے اس کی نظیر قائم کردیں کہ شریعت میں صرف اتنا ہی نہیں ہے جو رسول بتلا گیا، بلکہ اسکے علاوہ بھی بہت کچھ کہا اور کیا جاسکتا ہے اور ہر ظن کو اس میں دخل ہے ہر رائے کو قاضی و آمر ہے ہر فلسفہ اس کا مالک و حاکم ہے یفعل ما یشاء و یختار۔ اور یا پھر قید خانے میں رہنا ہر روز کوڑوں سے پیٹا جانا ... امام احمدؒ کو قید کیا گیا۔ قید خانے میں بھیجے گئے۔ چار چار بوجھل بیڑیاں پاؤں میں ڈالی گئیں یہ پہنے ہوئیں۔ اسی عالم میں

بغداد سے سرطوس چلے گئے.... رمضان مبارک میں جلتی دھوپ میں بٹھائے گئے۔ اور اس پیٹھ پر جو علوم و معارف نبوت کی حامل تھی لگاتار کوڑے اس طرح مارے گئے۔ کہ ہر جلاد دو ضربیں پوری قوت سے لگا کر پیچھے ہٹ جاتا۔ اور پھر نیا تازہ دم جلاد اس کی جگہ لیتا۔ اس کو بھی خوشی خوشی برداشت کر لیا۔ مگر اللہ کے عشق سے منہ نہ موڑا۔ اور راہ سنت سے منحرف نہ ہوئے.... حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں (امام کو) عین حالت صوم میں کہ صرف پانی کے چند گھونٹ پی کر روزہ رکھ لیا تھا۔ نو تازہ دم جلادوں نے پوری قوت سے کوڑے مارے یہاں تک کہ تمام پیٹھ زخموں سے چور ہو گئی اور تمام جسم خون سے رنگین ہو گیا... انہیں اسی[۸۰] کوڑے ایسے سخت مارے گئے۔ کہ اگر ہاتھی کے بھی مارے جاتے تو چیخ اٹھتا۔ مگر اس کوہ عزم و ہمت نے اُف تک نہ کی[۱]۔ ایسے بزرگوار کے حق میں یہ کہنا کہ وہ امراء و سلاطین کے دروازوں پر جا جا کر فرمائش کیا کرتے تھے۔ کہ کسی حدیث کی ضرورت ہو تو بتا کر پیش کر دی جائے۔ کس درجہ غیر ذمہ دارانہ قول ہے۔ اور کس قسم کی ناانصافی ہے۔ نیاز صاحب اور ان کے ہم مسلک حضرات ہمیشہ سے اسی روش پر گامزن ہیں۔ کہ دین سے تعلق رکھنے والے علما اور محدثین کو شاہی درباروں کا خادم بنایا جائے اور اس طرح حدیث کے سرمایے کو دفتر بے معنی قرار دیا جائے۔

۱؎ ص ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۴۸: تذکرہ ابوالکلام آزاد

صحیحین میں اختلاف فروعی مسائل میں ہے۔ ان معاملات میں ہرگز نہیں ہے جن پر کسی کے کافر یا مسلمان ہونے کی اساس ہو۔ علامہ جی نے یہ تاثر حدیث سے بدظن کرنے کے لیے پیدا کرنا چاہا ہے۔ اقتباس ۳ میں از سر نو جدید معیار تنقید کے لحاظ سے ریسرچ کرنے کا خیال محض ایک دل لگی ہے۔ جو بعد کی دو سطروں کے مطالعہ پر واضح ہو جاتی ہے۔ علماء کے ساتھ تمسخر کرنے کے بعد جب وہ یہ لکھتے ہیں کہ محفوظ صورت یہ ہے کہ اسلام و اصول اسلام کا مطالعہ احادیث سے بالکل علیحدہ ہو کر کیا جائے، تو ان کا مافی الضمیر بھی عیاں ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد خلاف عقل احادیث کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اسلام کے اس خزانۂ علمی کو سائنس اور عقلیات جدیدہ کے منافی قرار دیا جا سکے۔ حوالہ ۵ میں جاہل مولویوں اور کم عقل واعظوں کا ذکر خیر اس لیے نہیں ہے کہ علامہ جی بانی اسلام پر تہمت تراشی کے خلاف ہیں، بلکہ اس لیے ہے کہ اسلام کے خدمت گاروں کو مولوی قاضی، صوفی، کم علم، رجعت پسند، وقیانوسی، زاہد خشک، ملائے مکتبی کے القابات سے نواز کر دل کی بھڑاس نکالی جائے اور دین کی اعلانیہ تضحیک کا حوصلہ نہ پا کر دین سے نسبت رکھنے والوں کی بیل تضحیک و توہین کی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ آہستہ آہستہ دین سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ یہ صاحب جن نظریات کے علمبردار ہیں وہ ان کے مندرجہ ذیل الفاظ سے عیاں ہو رہے ہیں۔

"اب آپ دیکھیے کہ قرآن کی ابتدا کن حالات میں ہوئی ہے۔ قبیلہ قریش میں ایک نہایت ہی پاکیزہ خصائل و صفات کا انسان پیدا ہوتا ہے اور ہوش سنبھالتے ہی اپنی قوم کو، اپنے عزیزوں کو نہایت مکروہ افعال میں مبتلا دیکھتا ہے۔ اس کا دل بہت کڑھتا ہے لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کہ وہ کیا کرے۔ وہ ذات کی تنہائیوں میں ساری دنیا سے کٹ کر، پہاڑ کے غاروں میں چھپ چھپ کر اس مسئلہ پر غور کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک قرن سے زیادہ اسی حال میں گزر جاتا ہے اس نے اپنی زندگی کا تنہا مقصود یہ قرار دے لیا ہے کہ وہ اپنی قوم کی اصلاح کرے گا اُن کی بُری عادتوں کو ان سے ترک کرائے گا اور جب سوچتے سوچتے اس کے جذبات میں انتہائی شدت پیدا ہو جاتی ہے تو بے اختیار وہ اپنا پیغام سنانے لگتا ہے۔ پھر اس پیام کے الفاظ یقیناً اسی شخص کے ہیں اور اسی زبان کے ہیں جو اُس وقت وہاں رائج تھی لیکن اس کا بدیع اسلوب بیان، اس کا بڑھا ہوا جوش اور اس کا اثر تیجہ ہے اس کیفیت کا جو اس کے دل و دماغ میں سالہا سال سے موجیں مار رہی تھی اور جو آخر ایک چشمہ کی طرح پھوٹ نکلی۔ اس کا نام وحی ہے اور اس کو الہام کہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس نے قرآن کی عبارت کو احادیث کی عبارت سے ممیز کر دیا ہے۔ احادیث کا اکثر حصہ تو ایسا ہے کہ جو یکسر موضوع ہے اور تھوڑا سا حصہ جسے موضوع نہیں کہہ سکتے اس کی حالت بھی یہ ہے کہ اس میں وہ احادیث زیادہ ہیں جو بالمعنی روایت کی گئی ہیں اور جن میں

رسول اللہ کے الفاظ من وعن نہیں نقل کیے گئے۔ صرف چند احادیث ایسی ہیں جن میں ہم رسول اللہ کے الفاظ کی جھلک پاتے ہیں[1]"

"کلام مجید کو میں نہ کلام خداوندی سمجھتا ہوں نہ الہام ربانی۔ بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں اور اس مسئلہ پر میں اس سے قبل کئی بار گفتگو کر چکا ہوں۔ کلام کا مفہوم اس وقت تک متعین نہیں ہو سکتا جب تک "نطق" اس سے متعلق نہ ہو۔ اور نطق نام ہے مخصوص عضلات کی حرکت کا اس لیے اگر ہم خدا سے کسی کلام کو منسوب کریں گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے لیے نطق بھی لازم ہوگا جس کا تعلق یکسر مادیات سے ہے[2]"

ہمارا خیال یہ ہے کہ ہندوستانی علامہ جن کو کلام نفسی اور کلام لفظی سے متعلق ان بحثوں کا علم ہوگا جو اسلامی مفکرین نے اس موضوع سے متعلق تحریر کی ہیں۔ وہ یہاں اس الجھن کی وجہ سے قرآن کو کلام الٰہی ماننے سے منکر نہیں ہیں کہ انھیں خداوند تعالیٰ کے ہاں اعضاء کا وجود ماننا پڑے گا۔ بلکہ اصل پریشانی صرف اتنی ہے کہ وہ سرے سے خدا ہی کے منکر ہیں۔ ان کے نزدیک نہ کوئی پیغام رساں ہے نہ پیغام ارسال کرنے والا۔ بلکہ ایک انسان جب کافی غور و فکر سے کام لیتا ہے تو ایک چشمہ کی طرح اس کے خیالات اس کے اندر سے پھوٹ کر باہر نکل آتے ہیں اور یہی وحی ہے اور اسی ہیجان کا نام الہام ہے۔

---

[1] من و یزدان ص ۴۱۶ [2] ایضاً ص ۴۰۵

اس اقتباس سے یہ بھی واضح ہے کہ علامہ جی کے خیال میں آنحضرت ؐ خودساختہ نبی تھے ان کے اندر یہ خواہش ابتدا ہی سے تھی کہ قوم کی اصلاح کرنی چاہیے۔ اس خواہش نے شدت اختیار کی تو انھوں نے پیغام دینا شروع کر دیا (نعوذ باللہ) ایسا عقیدہ رکھنے والے سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قرآن کو منزل من اللہ سمجھتا ہوگا خود فریبی سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر افسوس ہے کہ نگار کا مطالعہ کرنے والے بعض حضرات نے اسی غلط فہمی کے زیر اثر علامہ جی سے مذہب کے بارے میں استفسارات کیے ہیں جن کا جوابی مجموعہ من و یزدال کی صورت میں طبع ہوا ہے۔

علامہ جی فرماتے ہیں:

"مگر افسوس کس قدر عبرتناک امر ہے کہ قرآن کے اس طرۂ افتخار کو جو قیامت تک مخالفین کے دلوں میں بھی رشک و حسد کی آگ بھڑکاتا رہے گا حدیث نے چھین لیا اور ابن عباس رضؓ کے ایک غیر ذمہ دارانہ قول نے قتل مرتد کی ایک بدعت پیدا کر دی۔ کہ کتنی جانیں اس خطرناک قول کے صدقے فنا ہوئیں کتنے لوگ اسلام ہی سے بدظن ہو گئے کتنوں نے اس کی آڑ میں اپنے دشمنوں کو راستے سے ہٹایا۔ اور یہ واضح ہے کہ ممالک اسلامیہ کی موجودہ پستی کی ذمہ داری صرف اسی ایک مسئلہ پر ہے۔ اگر ایک مجہول حدیث نے کچھ کمی چھوڑی تھی تو اس کی تکمیل فقہ کے ہاتھوں سے ہوئی" ص ۱۲۔ نگار جون ۱۹۳۱ء۔

اس اعتراض کا جواب ۸ ار دسمبر ۱۹۳۱ء کے اہلحدیث میں مولانا ثناء اللہ مرحوم نے جو دیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے :

"جب مذہب ہی دونوں قوموں میں موجب محبت اور باعث عداوت تھا تو جو شخص ادھر سے جاتا پھر اس کے دل میں جانے سے پہلے ادھر کی عداوت پیدا ہو جاتی۔ اب اس میں دو باتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ ایک ترک اسلام۔ دوم عداوت اہل اسلام۔ بلکہ یہ کہیے کہ در باطن ترک اسلام عداوت کی فرع ہے اور در ظاہر عداوت ترک اسلام کی فرع۔ . . . لہٰذا جو لوگ داخل اسلام ہو کر پھر اغیار میں جا ملیں وہ کتنی کچھ سزا کے مستحق ہوں گے . . . . . " ص ۳۔

نگار کا یہ کہنا کہ کتنی جانیں فنا ہوئیں کتنے لوگ اسلام سے بدظن ہوئے محض ایک افسانہ ہے تاریخ اسلام میں قتل مرتد کی وارداتیں اتنی مرگز نہیں ہیں جن کا تصور دلا کر علامہ جی نے قارئین کے جذبات سے اپیل کی ہے۔ علاوہ ازیں اپنے دشمنوں کو اس کی آڑ میں راستے سے ہٹانے کی مثال پیش کر دیتے تو ان کی بات وزنی ہو جاتی مگر وہ ایسا نہیں کر سکے۔ ان سب باتوں سے زیادہ جھوٹی بات یہ ہے کہ ممالک اسلامیہ کی موجودہ پستی کو صرف اسی ایک مسئلے کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے ممالک اسلامیہ میں کہاں کہاں اس پر عمل ہوتا ہے اور کن کن سالوں میں اور کن کن ممالک میں اس کی وجہ سے پستی آئی ہے اس کی مثال تو دی ہوتی۔

ناظرین! یہ سارا زور خطابت اس لیے ہے کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کے اندر اپنی انصاف پسندی کے تاثرات پیدا کر کے حدیث کے ساتھ لفظ

مجہول کو منسلک کرنے کے لیے میدان ہموار کیا جائے۔ ممالک اسلامیہ کی پستی کی اصلی وجوہات جاننے والے اصحاب اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ علامہ جی کی تشخیص کتنی سچی معنی اور لایعنی ہے۔

ناظرین! مدیر نگار قرآن کو کلام الٰہی ماننے سے انکاری ہیں (حوالہ ص ۲۱۴) اس کے باوجود جب وہ لکھتا ہے کہ قرآن مجید نے دنیا کے تمام مذاہب سے علٰحدہ یہ عجیب و غریب اصول پیش کیا تھا کہ مذہب میں کوئی جبر نہیں اور انسان اپنی رائے میں آزاد ہے اور اپنے ذاتی اعتقاد میں سوائے خدا کے کسی کا مسئول اور جواب دہ نہیں[1]"

تو ایک قاری اس سے یہی تاثر لے سکتا ہے کہ مدیر موصوف قرآن کو خدا کا کلام سمجھتا ہے اور وہ صرف حدیث کا منکر ہے۔

حضرات! یہ انداز بیان محض فریب دینے کے لیے ہے مدیر موصوف کا عقیدہ وہی ہے جو انھوں نے وحی اور الہام کی تشخیص کرتے وقت بیان کیا ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ پہلے حدیث کے قلعہ پر حملہ کر کے اسے مسمار کر دیا جائے اور اس کے بعد قرآن کی تحریف میں آسانی ہو جائے گی۔ اپنی مرضی سے، حالات کے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے تشریح کرنے پر قرآن ہوتے ہوئے بھی نہ ہونے کے برابر ہو جائے گا۔ قرآن کے متعلق ان کے نظریات کا ایک نمونہ اور ملاحظہ

---

[1] نگار جولائی ۱۹۳۱ء

کیجیے:

"کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور نہ اسے کلام مجید میں درج ہونے کی وجہ سے صحیح کہا جا سکتا ہے۔ عہد نبوی میں اس قسم کی روایتیں توراۃ و انجیل کے حوالے سے لوگوں کو سمجھانے اور ڈرانے کے لیے یہود و نصاریٰ کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں اور چونکہ توریت و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا اس لیے رسول اللہ نے بھی ان کو محض اعتبار و بصیرت کے لیے بیان کر دیا اور اس سے کوئی بحث نہیں کی کہ یہ صحیح ہیں یا غلط"[1]

اسی عقیدے کو ۱۲۱ پر دوبارہ بیان کیا گیا ہے ہم ان سطور کا خلاصہ نمبروار درج کرتے ہیں۔

۱۔ قرآن میں جو قصے بیان ہوئے (وہ بقول نیاز صاحب) غلط ہیں۔

۲۔ تورات اور انجیل کو الہامی کتابیں سمجھنا غلط خیال ہے۔

۳۔ رسول اللہ (صلعم) نے ان غلط قصوں کو ان کی صحت یا عدم صحت کی پڑتال کیے بغیر قرآن میں درج کر دیا تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔

گویا کہ رسولؐ کے پاس کسی واقعہ کو پرکھنے کے لیے کوئی غیبی ذریعہ نہیں تھا۔ ان کا کام صرف سمجھانا تھا چاہے اس کے لیے جھوٹے قصے ہی

---

[1] من ویزداں ص ۴۰۷

سنانے پڑیں۔

قارئین کرام اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس علامہ کے یہ نظریات ہوں اس کے دل میں رسول اللہ کی کیا قدر و منزلت ہوگی اور اس کے باوجود وہ آپ کو رسول اللہ کہتا ہو تو اس نسبت و رسالت کے اظہار میں وہ کس حد تک خلوص سے کام لے رہا ہوگا جو شخص سچے اور جھوٹے میں تمیز نہ کر سکے۔ وہ اللہ کا رسول کیسے ہو سکتا ہے؟

یہ سب کس لیے ہے!

اسی لیے کہ علامہ نیاز صاحب نہ خدا کے قائل ہیں نہ رسالت کے۔ وہ اپنے اصلی عقیدے کا اظہار صاف صاف کرتے ہیں تو ایک طرف اُن کی مخالفت زیادہ ہوتی ہے اور دوسری طرف ان کی سنتا کون ہے۔ لہٰذا پہلے وہ رسولؐ کی احادیث پر حملہ کرتے ہیں اس حملے میں وہ مسلمانوں کے دفاع کا اندازہ کر پائیں گے جس طرح کہ کسی ملک کی جنگی طاقت کا اندازہ کرنے کے لیے سرحدی جھڑپیں کی جاتی ہیں یعنی جب حدیث پر حملہ برداشت کر لیا گیا تو وہ پوری قوت کے ساتھ قرآن اور قرآن کے نظام پر حملہ آور ہوں گے۔

ان علامہ جی کے مبلغ علم و عرفان کے ان چند حوالوں کے بعد ہم پاکستان کے ایک بہت بڑے علامہ غلام احمد پرویز مدیر طلوع اسلام لاہور کے چند ارشادات ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ دیکھیے ان بزرگواروں کے مزاج

اور افتادِ طبع کی تعمیر میں جو عناصر اربعہ کارفرما ہیں اُن کے خدوخال آپس میں کس درجہ ہم رنگ ہیں۔

آپ "طلوعِ اسلام کا مسلک" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

"طلوعِ اسلام جس مسلک کو ایک عرصے سے پیش کر رہا ہے وہ مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہے۔ لہٰذا صحیح اسلامی نظام یہ ہے کہ ہم (ہم سے مراد ہے ہر دور کے مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ) قرآن کریم کو اپنے نظام کا محور قرار دیں اور اس کے اصولوں کی روشنی میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود جزئیات متعین کریں۔ ان جزئیات کے تعین میں ہم ان کوششوں کو بھی سامنے رکھیں گے جو اس سے پہلے اسی نہج و اسلوب پر ہوتی رہی ہیں۔ ان میں جو چیزیں ایسی ہوں گی جن میں کسی تغیّر کی ضرورت نہیں انھیں علی حالہٖ رہنے دیا جائے گا۔ دوسروں میں مناسب تبدیلیاں کر لی جائیں گی اور نئے امور کے نئے فیصلے کیے جائیں گے اور اس ساری کوشش کی اصل و بنیاد یہ ہو گی کہ کوئی شے قرآن کریم کے اصول سے نہ ہٹنے۔ یہ ہے اسلامی نظام کی صحیح روح۔ یہی رسول اللہ نے کیا تھا۔ اسی کے مطابق اس خلافت کے دور میں عمل رہا جو علیٰ منہاج النبوۃ قائم تھی۔ اور اسی کے مطابق پھر سے اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے (قرآنی دستور پاکستان ص ۱۱ ۲)۔ ...... اس اصول سے جو جزئیات متفرع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔

اسلامی یعنی اسلامی نظام کا اصل الاصول قرآن ہے۔ قرآن کے معانی واضح اُس کی عبارت صاف اور سلجھی ہوئی اور اس کی تعلیم کھلی کھلی اور نکھری ہوئی ہے۔

۲۔ قرآن نے بالعموم دین کے اصول دیے ہیں۔ ان اصولوں کی جزئیات اسلامی نظام حکومت اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود متعین کرے گا۔

۳۔ سب سے پہلے ان جزئیات کو نبی اکرم صلعم نے متعین فرمایا۔ حضورؐ کے بعد دورِ خلافت علی منہاج النبوت میں ان جزئیات میں جن کے متعلق ضرورت سمجھی گئی۔ مناسب رد و بدل ہوتا رہا اور جن میں کسی تبدیلی کی کوئی ضرورت نہ سمجھی گئی انھیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا گیا۔

۴۔ جو نئے امور پیش آئے اُن کے لیے نئی جزئیات متعین کی گئیں۔

۵۔ آج جو اسلامی مملکت علی منہاج النبوت قائم ہوگی اسے بھی یہی کچھ کرنا ہوگا۔[1]

"طلوعِ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ جن احکام کو قرآن کریم نے صرف اصولاً" بیان کیا ہے اور ان کی جزئیات کا تعین نہیں کیا۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے دانستہ اسی طرح چھوڑ دیا ہے۔ اگر منشائے خداوندی یہ ہوتا کہ ان کی جزئیات بھی

---

[1] مزاج شناسِ رسول ص ۲۲۳-۲۲۴

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رہیں تو قرآن کریم میں ان جزئیات کو بھی خود ہی متعین کر دیا جاتا۔[۱]"

"قرآن کی تعلیم بالکل صاف اور واضح ہے۔ وہ اپنے مفہوم کے تعین کے لیے کسی خارجی مدد کا محتاج نہیں۔ نہ تفاسیر کا اور احادیث کے ذخیرہ کا۔[۲]"

"احادیث کے متعلق طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جس قدر وحی نازل ہوئی۔ وہ سب قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ نے جو کچھ فرمایا وہ حضورؐ کے اپنے ارشادات تھے۔ کلام اللہ نہیں تھا۔[۳]"

"طلوع اسلام یہی کہتا ہے کہ ہم احادیث کے مجموعوں کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ جن چیزوں کو رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ در اصل رسول اللہ کی ہیں بھی یا نہیں۔ اس لیے یہ چیزیں دین کا مدار قرار نہیں پا سکتیں۔ کیونکہ دین کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا ہے کہ اسے لا ریب فیہ[۴] ہونا چاہیے۔[۵]"

"طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ کہ کونسی چیز شرعی ہے اور کونسی شرعی نہیں صرف مسلمانوں کا اسلامی نظام کر سکتا ہے۔[۶]"

---

۱ مزاج شناس رسول ص ۲۲۶ ۲ ایضاً ص ۲۲۹

۳ ایضاً ص ۲۳۰ ۴ علامہ جی کو صرف لاریب لکھنا چاہیے تھا۔

۵ مزاج شناس رسول ص ۲۴۱ ۶ ایضاً ص ۲۴۱

ہم اس مسلک کے نار و پود کا جائزہ لیں گے اور یہ کوشش کریں گے کہ اس مسلک کی صحیح صورت واضح کر سکیں۔ علامہ جی اپنے آپ کو اقبال مرحوم کا پیرو قرار دیتے ہیں۔ طلوع اسلام میں اقبال کے اشعار کا اقتباس بکثرت موجود ہوتا ہے۔ علامہ جی کی اقبال سے یہ نسبت اس لیے نہیں کہ انھیں اقبال کا مسلک پسند ہے بلکہ اس لیے کہ پاکستان کے پڑھے لکھے لوگ اقبال مرحوم سے عقیدت رکھتے ہیں۔ لہٰذا اس نسبت کے پردے میں علامہ جی اپنے خیالات کا اظہار آسانی سے کر رہے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباسات کا خلاصہ یہ ہے کہ :

۱۔ قرآن کریم کو اسلامی نظام کا محور قرار دیا جائے۔

۲۔ اس کے اصولوں کی روشنی میں جزئیات کا تعیّن ہو۔

۳۔ یہ تعیّن ہر دور کے تقاضوں کے مطابق ہو۔

۴۔ اس تعیّن کے وقت پہلے کی کوششوں کو سامنے رکھا جائے۔

۵۔ نئے امور کے نئے فیصلے ہوں۔

۶۔ رسول اللہ نے ایسا ہی کیا تھا۔

۷۔ دور خلافت راشدہ میں اسی طرح عمل رہا۔

۸۔ دور خلافت راشدہ میں حضور کی مقررہ کردہ جزئیات میں ردّوبدل ہوتا رہا۔

۹۔ اصولی احکام کی جزئیات کا تعیّن قرآن کریم میں اس لیے نہیں کیا گیا کہ ان جزئیات کو ابدی حیثیت حاصل نہیں

۱۰۔ قرآن اپنے مفہوم کے تعیّن کے لیے کسی خارجی مدد کا محتاج نہیں نہ تفاسیر کا، نہ احادیث کے ذخیروں کا[1]

۱۱۔ قرآن کے علاوہ رسول اللہؐ نے جو کچھ فرمایا وہ حضورؐ کے اپنے ارشادات تھے کلام اللہ نہیں تھا۔

۱۲۔ جن چیزوں کو رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ان کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ حضورؐ کی ہیں بھی یا نہیں۔

۱۳۔ شرعی اور غیر شرعی (حلال و حرام۔ جائز و ناجائز) کا فیصلہ صرف مسلمانوں کا اسلامی نظام کر سکتا ہے۔

(۱-۲) اس لیے موجود ہیں کہ کوئی شخص قرآن کے اصولوں کو غیر واضح یا مبہم نہیں کہہ سکتا۔ اجمال اور تفصیل میں جو فرق ہے اسے بآسانی نظر انداز کر کے قرآن کے جامع اور مکمل ہونے کا تصوّر دلا کر اس الجھن کو پیدا کیا جا سکتا ہے کہ جب قرآن خود مکمّل اور واضح ہے تو احادیث کی ضرورت کیا ہے؟ مولوی عبداللہ چکڑالوی اور اُس عہد کے دوسرے منکرین حدیث کا یہ پرانا طریقہ ہے جسے آج کے منکرین حدیث بھی برابر استعمال میں لا رہے ہیں۔

(۳) اس تقاضوں کا ذکر اس لیے ہے کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کو بتایا جا سکے

---

[1] گذشتہ اوراق میں آپ نے ملاحظہ کر لیا ہے کہ صرف نماز کے حکم کی تشریح کے سوال کا جواب حدیث سے بے نیاز ہو کر منکرین نہیں دے سکے

کہ دینِ اسلام زمانے کے تقاضوں سے بے نیاز نہیں رہتا اور نہایت ماڈرن ہے اور جو لوگ ہمارے ہم نوا نہیں وہ ترقی کے دشمن ہیں۔ جاہل ہیں۔ کم علم ہیں۔

(۴) سابقہ کوششوں کو سامنے رکھنا اس لیے ہے کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ تم عہدِ نبویؐ کی کاوشوں کو نظر انداز کیوں کرتے ہو۔ ان کی تشفی کے لیے سابقہ کوششوں کو بھی ووٹ دینے کا حق دیا گیا ہے۔ یہ سابقہ کوششیں کیا تھیں۔ ان کا ثبوت ان کا بیان ان کا ریکارڈ طلب کیجیے تو جواب یہی مل سکتا ہے کہ ان کا بیان احادیث میں ہے۔ اب اگر یہیں تک اکتفا ہوتا تو طلوعِ اسلام حدیث سے بہرہ مند ہونے کا اقراری ٹھہرتا (اور یہ اس کے مسلک کے خلاف ہے) لہٰذا کہا گیا ہے "۱۲۔ حضورؐ سے جو باتیں منسوب کر دی گئی ہیں۔ ان کی صحت میں شک ہے" چلو سابقہ کوششوں کا بیان بھی ہو گیا اور ان سے چھٹی بھی مل گئی۔ اب آپ ۱۰ کو ملاحظہ کریں گے تو یہ بات صاف ہو جائے گی کہ احادیث کی ضرورت نہیں بلکہ ایک سوال باقی رہ ہی جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام کو یہ اطلاع کہاں سے ملی کہ:

۶۔ رسول اللہؐ نے ایسا ہی کیا تھا۔

۷۔ دورِ خلافتِ راشدہ میں اسی طرح عمل رہا۔

۸۔ دورِ خلافتِ راشدہ میں حضورؐ کے فیصلوں میں ردوبدل بھی ہوتا رہا۔

اگر احادیث سے اور اس دور کی کتب تاریخ سے معلوم ہوا ہے۔ تو آپ کے نزدیک تو ان ذخیروں پہ یقین ہی نہیں کیا جا سکتا اب جو ان کو صحیح مان رہے

ہیں اپنے مطلب کی خاطر ایسا کر رہے ہیں اور جہاں اپنا مطلب نہیں نکلتا وہاں شک کو اجازت عام عطا فرماتے ہیں۔ آخر یہ دو عملی کیوں۔ قرآن کے کس اصل کی رو سے یہ جائز ہے۔ اگر آپ کی یہ اطلاعات حدیث کے سوا کسی اور ذریعہ سے ہیں تو اس کا حوالہ دیجیے۔

ناظرین! سچی بات تو یہ ہے کہ ان منکرین کے نزدیک حضور کا مقام رسالت کسی خاص توجہ کا حق دار ہی نہیں ہے ملاحظہ ہو ۱۱ "قرآن کے علاوہ رسول اللہ نے جو کچھ فرمایا۔ وہ حضور کے اپنے ارشادات تھے، کلام اللہ نہیں تھا۔"

بندہ پرور آپ حضور کے اپنے ارشادات کو محض برائے نام ہی بیان کر رہے ہیں۔ اول تو آپ ان کے وجود ہی کے منکر ہیں۔ اور اگر ان کے ایک آدھ خدوخال کو مانتے بھی ہیں تو اسے محض حضور کی بشری پسند یا ناپسند قرار دے کر دین کا جزو نہیں مانتے آپ نے کلام اللہ کو بظاہر اللہ ہی سے نسبت دی ہے مگر درون خانہ بات وہی ہے جسے ہندوستانی علامہ نیاز صاحب نے کھل کر بیان کر دیا ہے کہ قرآن کو میں کلام اللہ نہیں مانتا (ملاحظہ ہو حوالہ ص ۲۱)۔

۱۲۔ رسول اللہ نے ایسا ہی کیا تھا یعنی امور کے تعین کے لیے صحابہ سے مشورہ کیا تھا۔ منکرین حدیث ایک حوالہ بھی اس دعویٰ کے ثبوت میں نہیں دے سکتے کہ کبھی حضور نے دین کے کسی اصل کی جزئیات تعین کرنے میں صحابہ

سے مشورہ لیا ہو۔ اور پھر ان بشری صلاحیتوں سے دین کو بنایا ہو۔ یہ حضورؐ پر ایک بہتان ہے۔

۸۔ دورِ خلافت علی منہاج النبوت میں حضورؐ کے کسی ایک فیصلے کو بھی بدلا نہیں گیا۔ یہ خلفائے راشدین پہ تہمت تراشی ہے[1]۔ آخر یہ ساری تہمت تراشی کیوں ہے؟ اس کا فائدہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہم دو حصّوں میں بیان کرتے ہیں۔

نکتہ ۱۳ کے ملاحظہ کے بعد جواب کا حصّہ اول یہ ہے کہ پاکستانی علامہ جی شرعی اور غیر شرعی امور و احکام کے تعین کا اختیار صرف مسلمانوں کے اسلامی نظام کو دے کہ وقت کی حکومت اور ان ارباب اختیار کو زیر احسان کر رہے ہیں۔ جو مملکت پاکستان میں اسلامی نظام کے رواج پا جانے کو پسند نہیں کرتے اور جن کے ذاتی اور جماعتی مفادات کو اس نظام سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

حصہ دوم یہ ہے کہ علامہ جی نے اپنے ذاتی مسلک کو بیان کرتے وقت اکثر یوں ارشاد کیا ہے۔ "طلوع اسلام یہ کہتا ہے۔ طلوع اسلام کا یہ مسلک ہے طلوع اسلام یہ ہے ــــ" اس انداز بیان اور اسلوب نگارش کا شان نزول

---

[1] اس مسئلہ کی تفصیلی بحث ترجمان القرآن منصب رسالت نمبر ستمبر ۶۱ء ص ۹۳-۹۹ پہ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

ذوقِ سلیم کو بدیں وجہ ناگوار گذرتا ہے کہ کہنے والا اپنے رسالہ کا ذکر یوں کر رہا ہے جیسے یہ کوئی الہامی کتاب ہے۔ توریت میں یوں ہے۔ انجیل کا یہ حکم ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے۔ ان فقروں سے جو کمال اور جامعیت ٹپکتی ہے اس کے ملاحظہ کے بعد ناظرین "طلوعِ اسلام یہ کہتا ہے" کو بغور ملاحظہ فرمائیں گے تو ان پر یہ امر بخوبی واضح ہو جائے گا کہ علامہ جی کس مقام سے "کلام ربانی" فرما رہے ہیں۔ یہ ادعا اور یہ تعلّی آمیز طرزِ خطاب اس لیے ہے کہ منکرِ حدیث دراصل نبوتِ جدیدہ کا مدعی ہوتا ہے۔ اس کے دل میں حضورؐ سے کوئی عقیدت نہیں ہوتی۔ اس کی بحثوں کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ حضورؐ بشرِ محض تھے۔ وہ عبدِ محض اور عبیدہ میں فرق نہیں کیا کرتا۔ بعض نادانی سے اپنے اس عقیدے کا اظہار کر بیٹھتے ہیں اور بعض مصلحت کوشی میں اسے چھپائے رکھتے ہیں۔ ہمارا یہ دعویٰ منکرینِ حدیث کے امام حشمت علی صاحب کے الہامات کے مطالعہ پر ثابت ہو جاتا ہے۔

مسجد بازار سرپا لوالہ لاہور میں چند مختلف فرقوں کے مسلمانوں کے نماز پڑھنے پر چکڑالوی فرقہ نے ان کے خلاف سرکار میں مقدمہ دائر کیا زیر دفعہ ۱۰۷۔ ان نمازیوں کی سال بھر کے واسطے ہزار ہزار روپیہ ضمانت ہو گئی۔ اور آئندہ اس مسجد میں مسلمانوں کی اذان۔ نماز۔ جماعت۔ جمعہ حتیٰ کہ مداخلت مسجد تک بند۔ اس چکڑالویوں کے امام حشمت علی صاحب نے اپنی صداقت

کا ایک زبردست ثبوت سمجھا چنانچہ اپنے رسالہ اشاعت القرآن اکتوبر ۱۹۲۵ء کے ص ۱۳ پر لکھتے ہیں :

"فقیر کو ان بدمعاشوں اور فحش گالیوں کے مقابلہ میں خدا کی طرف سے وقتاً فوقتاً یہی القا ہوتا رہا [۱] انا کفینٰک المستھزءین - [۲] الیس اللّٰہ بکافٍ عبدہٗ - [۳] واصبر لحکم ربک فانک باعیننا - [۴] واصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل ولا تستعجل۔ پھر ایک روز مخالفین نے فقیر کو سخت تکلیف دی اور ایک میرے عزیز بیٹے داماد کو صدمہ پہنچایا میں نے اس اضطراری حالت میں دعا کی رب انصرنی بما کذبون - رب نجنی واھلی مما یعملون - رب انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین - اسی قسم کی فقیر نے کثرت سے دعائیں مانگیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے القا ہوا فاصبر لحکم ربک ولا تکن کصاحب الحوت فاصبر صبراً جمیلاً - فاصبر علی ما یقولون - اسی قسم کی صبر دینے والی آیات کثرت سے مجھے یاد دلائی گئیں اور آخر کار فرمایا فاصبر ان العاقبۃ للمتقین - اور اسی قسم کی آیات سے تسکین و اطمینان کی طرف توجہ دلائی گئی۔"

ناظرین! چونکہ اللہ تعالیٰ صادق الوعد اور لا یخلف المیعاد ہے۔ اس لیے اس کے مطابق یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ نے اُس شخص کے ہاتھ سے کرایا

جس کو ہمارے مخالف اپنا مذہبی دشمن کہتے تھے اور ہمیں بھی اس کے پاس
فیصلہ لے جانے کی وجہ سے مخالف اپنے مصنوعی اسلام سے کافر
بتلاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس سے وہی فیصلہ کرایا جو بالکل قرآنی
عدل اور صداقت کے ماتحت تھا۔"

اس کے بعد اس فیصلہ کے ترجمہ کو اپنے رسالہ میں فخریہ درج کرنے سے
پہلے بڑے جلی حروف میں یوں لکھا ہے۔

"اور یہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے مطابق ظہور میں آیا
جو ایک سلیم الفطرت انسان کی قلم سے نکلا۔"

فیصلہ جو کچھ ہوا وہ تو ناظرین اوپر پڑھ چکے ہیں اب اُس فیصلہ کی نسبت چکڑالوی
ملہم نے اپنے اس رسالہ کے صفحہ ۸ پر یوں لکھا ہے۔

"ناظرین کرام! کیا آپ صداقت اور عدالت سے کہہ سکتے کہ اسلامی فرقوں
میں کوئی مولوی اور مشائخ اور حاکم ہیں یہ فیصلہ دے سکتا ہے جو ایک
منصف مزاج اور عادل حق پسند رائے صاحب لالہ شنکر داس سٹی
مجسٹریٹ بارک اللہ نے دیا ہے؟ نہیں نہیں وہ تو وہی فیصلہ دے گا
جو سرحد میں امیر صاحب نے ایک بے جرم قرآنی قوانین سے بے خبر
کے حق میں رجم کا حکم دیا ہے..... الخ"

یہ چند الفاظ نمونہ ہیں از رسالہ چکڑالویاں۔ اس کو پڑھ لینے کے بعد ذرہ آپ وہ الہام د

وحی بھی اب پڑھ لیجیے کہ جو آپ کو فیصلہ مذکورہ بالا کے خلاف ہماری طرف سے اپیل دائر ہونے پر ہوا چنانچہ چکڑالوی ملہم نے اپنے اسی رسالہ کے سفید صفحہ کو یوں سیاہ کیا ہے۔

"اطلاع ع مقدمہ مسجد اہل قرآن لاہور۔ ہمارے مخالفین میں سے ایک ملزم نے بوکالت مسٹر محمد اکرم بیرسٹر ایٹ لا۔ بنا راضگی فیصلہ سٹی مجسٹریٹ صاحب بہادر لاہور ڈسٹرکٹ صاحب بہادر کی عدالت میں اپیل کی ہے۔ شاید اُس کی یہ مرضی ہے کہ مجھے مسجد اہل الذکر و القرآن میں مداخلت بے جا کرنے کی اور بدامنی پھیلانے کی کسی طرح کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ ویدہ باید بفضل اللہ ما یشاء۔ و یحکم ما یرید۔ و ما توفیقی الا باللہ۔ افوض امری الی اللہ"۔

(یعنی خدا نے جو چاہا سو کیا۔ اور جیسے چاہا فیصلہ کر دیا۔ اور میں نے خدا کی دی ہوئی طاقت کے بغیر کچھ نہیں کیا۔ اور میرے سلسلہ کی باگ ڈور اللہ ہی پر ہے)۔

حضرات! یہ سب کچھ پڑھ لینے کے بعد حشمت علی چکڑالوی ملہم کے الہام کے تمام عنکبوتی تار و پود کو بکھیرنے کی خاطر آپ کو ذرہ بھر بھی تکلیف اٹھانی نہیں پڑے گی جب کہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ ہ نومبر ۱۹۲۵ء کو بیرسٹر محمد اکرم کی تقریر کو بغور سنکر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فیصلہ آسمانی مذکورہ بالا کو ایک دم توڑ دیا اور

ہم مخالفین کی ضمانتیں منسوخ۔ اور اب مسجد متنازعہ میں ہر مسلمان کو اپنے اپنے طریق پر مذہبی فرائض ادا کرنے کا اذن عام ہے۔" (اہلحدیث ۲۵ر دسمبر ص۵)

حقیقت؟

اصل حقیقت یہ ہے کہ منکرین حدیث در باطن منکر رسالت ہوتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر منکر خدا ہوتے ہیں اس لیے ان کے دل میں یہ خواہش رہ رہ کر اٹھتی اور موجزن ہوتی ہے کہ "ہم تشریع کا حق صرف ابن عبداللہ کو کیوں دیں۔ ہم بھی انسان ہیں۔ وہ بھی انسان تھے۔ آج علوم و فنون کی ترقی کا دور دورہ ہے۔ ہمارے سامنے علم کے حصول کے اعلیٰ ذرائع موجود ہیں۔ لہٰذا انسانیت کی فلاح کے لیے ہم بھی نیک مشورے دے سکتے ہیں۔" جب ان کے دلوں میں اس قسم کے وسوسے جاگزیں ہو جاتے ہیں تو اس کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان کے الہامات شیطانی القا کا نتیجہ ہیں یا ایجاد بندہ ہیں۔ ان سے جو کچھ بن آئے کرتے ہیں شیطان لعین ان کا دست راست بن جاتا ہے

اوران کے مبلغ علم سے اس طرح کے سوالات عالم وجود میں آتے ہیں۔

۱۔ کیا رسولؐ منتہائے سوال ہے؟

۲۔ کیا رسولؐ اصل مطاع ہے؟

۳۔ اُس کی شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت میں کیا فرق ہے؟

۴۔ کیا رسولؐ کے فیصلوں کو زمانہ کے اقتضا کے مطابق بدلا جا سکتا ہے؟

۵۔ کیا رسولؐ کے بغیر کوئی اور با اختیار انسان تشریعی حیثیت رکھتا ہے؟

۶۔ رسولؐ کے فیصلے حجت ہیں یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس خواہش کے باوجود منکرین حدیث کے تمام فرقے مل کر آج تک ذیل کے سیدھے سادے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دے سکے۔ ان سے ان کے تمام غلط دعاوی کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے جو وہ احکام دین کو صرف قرآن میں محدود اور محصور (وہ بھی ایک اسکیم کے تحت) بتلانے کے لیے پیش کیا کرتے ہیں۔

سوالات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ نماز کس طرح شروع کریں اور کس طرح ختم کریں۔

۲۔ کون کون سے ارکان اور کس ترتیب سے ادا کریں۔

۳۔ ہر رکن میں کیا کیا اذکار پڑھے جائیں۔

۴۔ فرض نمازوں میں اختلاف رکعات کس دلیل سے ہے۔

۵۔ نماز کے اندر بھول چوک ہو جائے تو کیا کیا جائے۔
۶۔ زکوٰۃ کے متعلق استفسار ہے کہ تمام عمر میں ایک ہی دفعہ فرض ہے
یا ہر سال یا ہر ششماہی یا ہر سہ ماہی وغیرہ کے بعد۔
۷۔ کس کس مال میں زکوٰۃ واجب ہے اور کس کس میں نہیں۔
۸۔ رمضان شریف میں کتنے دن تک روزہ رکھنا فرض ہے۔
۹۔ حج تمام عمر میں ایک ہی دفعہ فرض ہے یا ہر سال۔
۱۰۔ طواف بیت اللہ اور سعی صفا و مروہ کتنی مرتبہ ہونی چاہیے۔
۱۱۔ عرفات کے میدان میں اور مشعر الحرام میں کس دن حاضر ہونا چاہیے۔
۱۲۔ منیٰ میں کس دن آنا چاہیے۔
۱۳۔ طواف بیت اللہ اور طواف زیارت کب ہونا چاہیے۔
۱۴۔ احرام کی جگہ مکی اور غیر مکی کے لیے یعنی میقات کون کون سے ہیں۔
۱۵۔ قربانی عید الضحیٰ کا حکم اور اس کی میعاد زیادہ سے زیادہ کتنے روز تک ہے۔
۱۶۔ ختنہ کرانے کا حکم کہاں ہے۔
۱۷۔ نماز جمعہ کی کتنی رکعتیں ہیں نیز جمعہ بوقت ظہر پڑھنے کا حکم کس آیت سے
نکلتا ہے۔
۱۸۔ صلوٰۃ عیدین کا حکم کہاں سے لیا گیا ہے۔
۱۹۔ نماز جنازہ کس طرح پڑھی جاتی ہے۔

۲۰۔ صدقۂ عید الفطر کا کیا ثبوت ہے۔

۲۱۔ اعتکاف کیا چیز ہے اور کب ہونا چاہیے۔

۲۲۔ کوّا۔ چیل۔ لومڑی۔ کتّا۔ گدھا وغیرہ کس دلیل سے حرام ہیں وغیرہ وغیرہ۔

(ماخوذ از استفسارات قاضی منظور حسین۔ اہلحدیث ۲۱ ستمبر ۳۴ء)

ان سوالات کے جوابات قرآن مجید سے مطلوب ہیں۔ جوابات ایسے ہوں کہ پوچھنے والے کو جملہ تفاصیل اور تشریحات قرآن ہی سے مل جائیں اور انسانی تفسیر تشریح، یا ایجاد بندہ کی دخل اندازی سے مبرّا ہوں۔

آپ دیکھیں گے کہ منکرین حدیث کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ ان کے امام الائمہ اور ان کے اوّلین تلامذہ نے صرف نماز اور اذان کے تعیّن کے سلسلہ میں جو اٹکل پچّو سے کام لیا ہے وہ ان کے ان مباحثوں سے عیاں ہے جو ہم نے اہلحدیث امرتسر سے نقل کر کے ہدیۂ ناظرین کیے ہیں۔

محال است سعدی کہ راہ صفا
تواں رفت جز از پئے مصطفیٰ

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ۝

انکارِ حدیث کے چار نقیب

اس کتاب میں

۱۔ نیاز فتحپوری

۲۔ اسلم جیراجپوری

۳۔ برق کیمبلپوری

۴۔ غلام احمد پرویز پٹالوی مدیر طلوع اسلام

کی

حدیث کو مٹانے کی چالیں بے نقاب کی گئی ہیں۔ اور یہ واضح کیا گیا ہے۔ کہ منکرین حدیث کے جدید حملے کس درجہ خطرناک ہیں یہ کتاب منکرین حدیث کے ۶۰ سالوں کی تاریخ پیش کرتی ہے۔

کتابت کاغذ عمدہ، صفحات ۳۰۰ قیمت تین روپیہ۔

مکتبہ مجددیہ، نور پور شرقی گجرات

ردِ بدعت

اس کتاب میں حضرت مجددِ الف ثانیؒ

کے مکتوبات کے حوالے دے کر یہ ثابت

کیا گیا ہے۔ کہ بدعت دین کے لئے نہایت

مہلک ہے۔ اور سنّت نبویؐ کے عظیم الشان

محل کو ڈھانے کی ایک خطرناک سازش

ہے۔

۲۰ × ۳۰ سائز صفحات ۹۶ کاغذ عمدہ طباعت نفیس

قیمت فی کاپی مجلّد ڈیڑھ روپیہ

مکتبہ مجددیہ نور پور شرقی۔ گجرات (پاکستان)

اقبالؒ

اور

منکرینِ حدیث

مصنّفہ

پروفیسر محمدؐ فرمان ایم۔اے